اسلام

کا

نظامِ تقسیمِ دولت

مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ

دارالاشاعت کراچی

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

حال ہی میں پاکستان کی وزارتِ قانون نے راولپنڈی میں ایک بین الاقوامی اسلامی کانفرنس منعقد کی تھی جس میں مراکش سے لیکر انڈونیشیا تک پورے عالمِ اسلام کے مسلمان اہلِ فکر کو مدعو کیا گیا تھا، غیر ملکی مندوبین میں سے مفتیٔ اعظم فلسطین جناب الحاج محمد امین الحسینی، جناب شیخ باقوری (جامعۃ الازہر)، جناب ڈاکٹر حب اللہ (جامعۃ الازہر) شیخ منصور المحجوب (چیف جسٹس لیبیا)، شیخ حسن کیتبی (سعودی عرب)، ڈاکٹر حسین نصر (ایران) شیخ عبد الرحمٰن الدکالی (مراکش) پروفیسر ابراہیم حسن (انڈونیشیا) کے نام بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ پاکستان کے علماء دین اور اہلِ فکر کی ایک بڑی تعداد نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔

یہ مقالہ ــــ "اسلام کا نظامِ تقسیمِ دولت" ــــ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم العالی نے اسی کانفرنس کے لئے تحریر فرمایا، اور ۱۲؍ ذیقعدہ ۱۳۸۷ھ مطابق ۱۲؍ فروری ۱۹۶۸ء کی صبح کو اس کی تلخیص کانفرنس

کے کھلے اجلاس میں پڑھ کر سنائی۔ اس محفل میں اہلِ علم وفکر کا منتخب ذہن موجود تھا، اس مقالے کو حاضرین نے بڑی دلچسپی کے ساتھ سنا۔ شیخ الازھر جناب باقوری نے مقالہ سن کر کہا:

"وَاللّٰہِ علمٌ عزیز!"

راقم الحروف اس میں موجود تھا، اجلاس کے بعد مختلف طبقہائے خیال کے حضرات سے مل کر میں نے محسوس کیا کہ مقالے نے سامعین پر غیر معمولی اثر چھوڑا ہے، ان سب کی زبان پر ایک ہی فرمائش تھی کہ اس مقالے کو الگ شائع کر دیا جائے چنانچہ زیرِ نظر رسالہ انہی حضرات کی فرمائش کی تعمیل ہے۔

ماہ محرم ۱۳۸۸ھ کے ماہنامہ البلاغ میں یہ مقالہ پورا شائع کر دیا گیا، اس کی اشاعت کے بعد اہلِ علم وفکر کے جو خطوط ہمیں موصول ہوئے ان سے اندازہ ہوا کہ علمی حلقوں میں اس کی غیر معمولی پذیرائی ہوئی ہے، روزنامہ جنگ راولپنڈی، الحق اکوڑہ خٹک، اور الفرقان لکھنؤ میں بھی اسے نقل کیا گیا، مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی نے ۱۹ اپریل ۱۹۶۸ء کے "صدق جدید" میں "ایک قابلِ قدر مقالہ" کے عنوان سے ایک ادارتی شذرے میں لکھتے ہیں:

"حضرت تھانوی رح کے علمی جانشین اس وقت دو صاحب ہیں... ان میں ایک صاحب سرپرستی ماہنامہ البلاغ (کراچی) کی کر رہے ہیں، اور رسالہ وقت کی ایک بہترین دینی خدمت انجام دے رہا ہے، اور ایک بہت بڑی بات پرچے کا اعتدال، اس کی میانہ روی اور اس کی غایتِ احتیاط ہے۔ اس کے تازہ نمبر (محرم اپریل) میں انہیں مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی ثم کراچوی کے

قلم سے ایک قابل دید مقالہ دولت کی تقسیم پر نکلا ہے۔ طریق تفہیم بالکل
علامہ تھانوی رح کے رنگ کا سادہ و سلیس عبارت میں بغیر مصطلحات فن سے
بوجھل کئے ہوئے اسلامی معاشیات کو پانی کی طرح حل کر دیا ہے" (ص ۴)

مقالہ کا صحیح مقام تو آپ اس کے مطالعہ کے بعد ہی معلوم کر سکیں گے، لیکن اتنا
عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس مقالہ میں تقسیم دولت کے موضوع پر بالکل اچھوتے
اسلوب سے خالص فنی انداز میں گفتگو کی گئی ہے، سرمایہ داری، اشتراکیت اور
اسلام کے مختصر مگر جامع تقابل کے علاوہ اس میں حرمت سود کی معاشی توجیہات
اور اسلام کے فلسفۂ ملکیت پر بھی فکر انگیز بحثیں آگئی ہیں۔ امید ہے کہ انشاءاللہ یہ
مقالہ علماء دین کے علاوہ معاشیات کے محققین کے لئے بھی نہایت کارآمد ثابت
ہوگا، اور جو حضرات اسلامی معاشیات کو مدون کرنا چاہ رہے ہیں ان کیلئے تحقیق
نظر کی نئی راہیں کھولے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ مقالہ زیادہ سے زیادہ ہمارے
اصحاب فکر کی نگاہوں سے گذرے، اور وہ پوری سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور فرمائیں۔ امید ہے
کہ آپ بھی اس کار خیر میں ہمارے ساتھ تعاون فرمائینگے، اور اس کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی
کوشش کریں گے۔ واللہ الموفق

محمد تقی عثمانی
مدیر ماہنامہ البلاغ، کراچی ۱۴

۲۸ ذیقعدہ ۱۳۸۷ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

"تقسیم دولت" کی بحث معاشی زندگی کے ان اہم ترین مباحث میں سے ایک ہے جنھوں نے آج کی دنیا میں عالمگیر انقلابات کو جنم دیا ہے، اور عالمی سیاست سے لیکر ایک فرد کی نجی زندگی تک ہر شعبہ اس سے متاثر ہوا ہے۔ صدیوں سے اس موضوع پر زبانی، قلمی اور حربی معرکے گرم ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ "وحیِ الٰہی" کی رہنمائی کے بغیر نری عقل کے بل پر اس موضوع کے سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس نے اس الجھی ہوئی ڈور کے خم و پیچ میں کچھ اور اضافہ کر دیا ہے۔

زیرِ قلم مقالے میں پیشِ نظر یہ ہے کہ قرآن و سنت اور مفکرینِ اسلام کی کاوشوں سے اس معاملے میں "اسلام" کا جو نقطۂ نظر سمجھ میں آتا ہے، اسے واضح کیا جائے، وقت کی تنگی اور صفحات کے محدود ہونے کی وجہ سے یہ تو ممکن نہیں ہے کہ اس موضوع کو پورے بسط اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے، البتہ اس کے اہم نکات کو اختصار مگر جامعیت کے ساتھ عرض کرنے کی کوشش ہوگی۔

قرآن و سنت اور اسلامی فقہ سے "تقسیمِ دولت" کے بارے میں اسلام کا جو موقف احقر نے سمجھا ہے، اسے بیان کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ کچھ بنیادی باتیں واضح کر دی جائیں جو اسلامی معاشیات کے تقریباً ہر مسئلے میں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں، انہیں آپ "اسلامی نظریۂ تقسیمِ دولت کے اصول" کہہ

لیجئے، اس کا "فلسفہ" سمجھ لیجئے، یا اس نظریئے کے مقاصد قرار دیجئے، بہر حال! یہ چند وہ باتیں ہیں جو قرآن کریم سے اصولی طور پر سمجھ میں آتی ہیں، اور اسلام کے معاشی طرزِ فکر کو غیر اسلامی معاشیات سے ممتاز کرتی ہیں۔

ا۔ معاشی مسئلہ کا مقام

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام رہبانیت[1] کا مخالف ہے اور انسان کی معاشی سرگرمیوں کو جائز، مستحسن بلکہ بسا اوقات واجب اور ضروری قرار دیتا ہے، انسان کی معاشی ترقی اس کی نگاہ میں پسندیدہ ہے اور "کسب حلال" اس کے نزدیک "فریضۃ[2] بعد فریضۃ" کا مقام رکھتا ہے، لیکن ان تمام باتوں کے ساتھ یہ حقیقت بھی اتنی ہی واضح ہے، کہ اسلام کی نظر میں انسان کا بنیادی مسئلہ "معاش" نہیں ہے، اور نہ "معاشی ترقی" اس کے نزدیک انسان کا مقصدِ زندگی ہے۔

معمولی سوجھ بوجھ سے یہ حقیقت سمجھ میں آسکتی ہے کہ کسی کام کا جائز، مستحسن یا ضروری ہونا ایک الگ بات ہوتی ہے۔ اور اس کا مقصدِ زندگی اور محورِ فکر و عمل ہونا بالکل جُدا چیز۔ اسلام کے معاشی مسائل پر بحث کرتے وقت بہت سی الجھنیں اور غلط فہمیاں انہی دو چیزوں کو خلط ملط کرنے سے پیدا ہوتی ہیں، اس لئے پہلے ہی قدم پر اس بات کا صاف ہو جانا ضروری ہے، درحقیقت اسلامی معاشیات اور مادّی معاشیات کے درمیان ایک گہرا، بنیادی اور دور رس فرق یہی ہے کہ مادّی معاشیات میں "معاش" انسان کا

---

[1] اسباب معاش کو بالکل ترک کر کے عبادت میں لگ جانا ۔ ۱۲

[2] دوسرے درجے کا فرض

بنیادی مسئلہ اور معاشی ترقیات اس کی زندگی کا منتہائے مقصود ہیں، اور اسلامی معاشیات میں یہ چیزیں ضروری اور ناگزیر سہی، لیکن انسان کی زندگی کا اصل مقصد نہیں ہیں۔

اس لئے جہاں ہمیں قرآن کریم میں "رہبانیت" کی مذمت اور "وابتغوا من فضل اللہ"[1] کے احکام ملتے ہیں، جہاں ہمیں تجارت کے لئے "فضل اللہ" اموال کے لئے "خیر" اور "التی جعل اللہ لکم قیاما"[2] خوراک کے لئے "الطیبات من الرزق" لباس کے لئے "زینۃ اللہ" اور رہائش کے لئے "سکن"[3] کے احترامی القاب ملتے ہیں، وہاں دنیوی زندگی کے لئے "متاع الغرور"[4] کے الفاظ بھی نظر آتے ہیں، ان سب چیزوں کے لئے "الدنیا" کا لفظ ملتا ہے جو اپنے لغوی مفہوم کے اعتبار سے کچھ اچھا تاثر نہیں دیتا، اور قرآنِ کریم کے مجموعی اسلوب سے بھی اس کی دناءت اور حقارت سمجھ میں آتی ہے۔

کوتاہ نظری اس موقعہ پر تضاد کا شبہ پیدا کر سکتی ہے، لیکن درحقیقت اس کے پیچھے اصل راز یہی ہے کہ قرآنِ کریم کی نظر میں تمام وسائل معاش انسان کی رہگذر کے مرحلے ہیں، اس کی اصل منزل درحقیقت ان سے آگے ہے، اور وہ ہے کردار کی بلندی اور اس کے نتیجے میں آخرت کی بہبود، انسان کا اصل مسئلہ اور اس کی زندگی کا بنیادی مقصد انہی دو منزلوں کی تحصیل ہے لیکن چونکہ ان دو منزلوں کو دنیا کی شاہراہ سے گذرے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا، اس لئے وہ تمام چیزیں بھی انسان کے لئے ضروری ہو جاتی ہیں

---

[1] اللہ کا رزق تلاش کرو۔ ۱۱ (۶۲ : ۱۰)
[2] مال کو اللہ نے تمہاری بقا کا ذریعہ بنایا ہے۔ ۱۲ (۴ : ۴)
[3] سکون و اطمینان کی جگہ ۱۲ (۱۶ : ۸۰)
[4] دھوکے کا سامان۔ ۱۲ (۳ : ۱۸۵)

جو اس کی دنیوی زندگی کے لئے ضروری ہیں، چنانچہ جب تک وسائلِ معاش انسان کی اصلی منزل کے لئے رہگذر کا کام دیں، وہ "فضل اللہ"، "خیر"، "زینۃ اللہ" اور "سکن" ہیں، لیکن جہاں انسان اسی رہگذر کی بھول بھلیوں میں الجھ کر رہ جائے اور اس پر اپنی اصل منزل مقصود کو قربان کر ڈالے یا بالفاظ دیگر وسائل معاش کو "رہ گذر" بنانے کے بجائے اپنی منزلِ مقصود کے راستے میں رکاوٹ بنا دے تو پھر یہی وسائلِ معاش "متاع الغرور"، "فتنۃ" اور "عدو" بن جاتے ہیں۔

قرآن کریم نے ایک مختصر جملے وابتغ فیما آتاک اللہ الدار الآخرۃ میں اسی بنیادی حقیقت کو بیان فرمایا ہے، اس کے علاوہ اس مضمون کی بہت سی آیات ہیں، اہلِ علم کے سامنے تمام آیات کو ذکر کرنے کی ضرورت نہیں، احقر کی رائے میں "انسانی معاش" کے متعلق قرآن کریم کی یہ روش اور اس کے دو مختلف پہلو نظر میں رہیں تو اسلامی معاشیات کے بہت سے مسائل حل کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

۲۔ دولت اور ملکیت کی حقیقت

دوسری بنیادی بات جو خاص طور سے "تقسیم دولت" کے مسئلے میں بڑی اہمیت رکھتی ہے، یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی تصریح کے مطابق "دولت" خواہ کسی شکل میں ہو اللہ کی پیدا کردہ اور اصلاً اسی کی ملکیت ہے، انسان کو کسی چیز پر ملکیت کا جو حق حاصل ہوتا ہے وہ اللہ ہی کی عطا سے ہوتا ہے، سورۂ نور میں قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وآتوھم من مال اللہ الذی آتاکم (۲۴ : ۳۳)

"اور انہیں اللہ کے اس مال میں سے دو جو اس نے تم کو عطا کیا ہے"

اس کی وجہ بھی قرآن کریم نے ایک دوسری جگہ بتلادی ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ یہی تو کر سکتا ہے کہ عمل پیدائش میں اپنی کوشش صرف کرے، لیکن اس کوشش کو بار آور کرنا، اور اس سے پیداوار کا مہیا کرنا خدا کے سوا کون کر سکتا ہے ؟ انسان کے بس میں اتنا ہی تو ہے کہ وہ زمین میں بیج ڈال دے، لیکن اس بیج کو کونپل، اور کونپل کو درخت بنانا تو کسی اور ہی کا کام ہے، ارشاد ہے:

أفرأيتم ما تحرثون؟ أأنتم تزرعونه أم نحن الزارعون (۵۶:۶۴)

"دیکھو تو جو کچھ تم کاشت کرتے ہو، کیا تم اسے اگاتے ہو یا ہم ہیں اگانے والے"

اور سورۂ یٰسین میں ہے:

ليأكلوا من ثمره وما عملته ايديهم افلا يشكرون

"یعنی ہم نے زمین میں چشمے جاری کیے تاکہ وہ درختوں کے پھل کھائیں، حالانکہ یہ پھل اُن کے ہاتھوں نے نہیں بنائے سو کیا وہ شکر نہیں کرتے" (۳۶:۳۵)

نیز ارشاد ہے:

أولم يروا أنا خلقنا لهم مما عملت ايدينا انعاما فهم لها مالكون (سورۂ یٰسین آیت ۷۱)

"کیا ان لوگوں نے اس پر نظر نہیں کی کہ ہم نے ان کے لئے جانوروں کو اپنے ہاتھ سے بنا کر پیدا کیا، پھر یہی لوگ اُن کے مالک بن رہے ہیں"

یہ تمام آیات اس بنیادی نکتے پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالتی ہیں کہ دولت، خواہ کسی شکل میں ہو، اصلاً اللہ کی پیدا کردہ اور اُسی کی ملکیت ہے، اور یہ بھی کہ اللہ تعالےٰ

جس کو عطا کر دیتے ہیں وہ اس کا مالک بن جاتا ہے۔ اور آخری آیت میں جہاں یہ بتلایا گیا ہے کہ ہر چیز کا اصل خالق اور مالک اللہ تعالیٰ ہے وہیں "ھم لھا مالکون" فرما کر بعطاء حق تعالےٰ انسان کی انفرادی ملکیت کو بھی واضح طور پر قائم کر دیا ہے۔ پھر اسلام کی نظر میں چونکہ "دولت" پر اصل ملکیت اللہ کی ہے، اور اسی نے انسان کو اس میں تصرف کرنے کا حق عطا کیا ہے، اس لئے اسی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس دولت پر انسان کے تصرفات کو اپنی مرضی اور اپنے مصالح کا پابند بنائے۔ چنانچہ انسان کو اپنی زیر تصرف اشیاء پر "ملکیت" تو حاصل ہے، مگر یہ ملکیت آزاد، خود مختار اور بے لگام نہیں ہے، اس پر دولت کے اصل مالک کی طرف سے کچھ حدود و قیود اور پابندیاں عائد ہیں، جس جگہ وہ اس دولت کو خرچ کرنے کا حکم دیدے، وہاں اس کے لئے خرچ کرنا ضروری ہے، اور جہاں خرچ کی ممانعت کر دے، وہاں رک جانا لازم ہے، اسی بات کو سورۂ قصص میں زیادہ وضاحت کے ساتھ کھول دیا گیا ہے:

وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ ۖ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا
وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ ۖ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ

"جو تجھ کو اللہ نے دیا ہے اس سے پچھلا گھر (آخرت کا توشہ) کما لے اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھول اور بھلائی کر جیسے اللہ نے تجھ سے بھلائی کی اور ملک میں خرابی ڈالنی مت چاہ" (۲۸ : ۷۷)

اس آیت نے اسلام کے فلسفۂ ملکیت کو خوب کھول کر بیان فرما دیا ہے، اس سے مندرجۂ ذیل ہدایات واضح طور پر سامنے آتی ہیں:

(۱) انسان کے پاس جو کچھ دولت ہے، وہ اللہ کی دی ہوئی ہے۔ (آتاك الله)

(۲) انسان کو اس کا استعمال اس طرح کرنا ہے کہ اس کی منزلِ مقصود دارِ آخرت ہو۔ (وابتغ...... الدار الآخرۃ)

(۳) چونکہ دولت اللہ کی دی ہوئی ہے، لہٰذا اس پر انسان کا تصرف حکم خداوندی کے تابع ہوگا، اب حکمِ خداوندی کی دو شکلیں ہیں، ایک یہ کہ وہ انسان کو اس بات کا حکم دے کہ مال کا کوئی حصہ کسی دوسرے کو دیدو، اس کی تعمیل اس لئے ضروری ہے کہ اللہ نے تم پر احسان کیا ہے، تو وہ تمہیں دوسرے پر احسان کا حکم دے سکتا ہے۔ (وأحسن کما أحسن اللہ إلیک)۔

(۴) دوسری شکل یہ ہے کہ وہ تم کو اس دولت کے تصرف سے منع کرے، اس کا بھی اس کو اختیار ہے، کیونکہ وہ تمہیں دولت کے کسی ایسے استعمال کی اجازت نہیں دے سکتا جس سے اجتماعی خرابیاں پیدا ہوں، اور زمین میں شر و فساد پھیلے (ولا تبغ الفساد فی الأرض)

یہی وہ چیز ہے جو اسلام کو سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کے نظریۂ ملکیت سے ممتاز کرتی ہے، سرمایہ داری کا ذہنی پس منظر چونکہ نظری یا عملی طور پر مادیت ہے، اس لئے اس کے نزدیک انسان کو اپنی دولت پر آزاد اور خود مختار ملکیت حاصل ہے، وہ اس کو جس طرح چاہے صرف کرسکتا ہے، لیکن قرآن کریم نے قومِ شعیب علیہ السلام کا ایک مقولہ نقل فرماتے ہوئے اس نظریئے کا مذمت کے پیرائے میں ذکر کیا ہے، وہ لوگ کہا کرتے تھے:

أصلوٰتک تامرک أن نترک ما یعبد آباؤنا أو أن نفعل فی أموالنا ما نشاء (۸۷:۱۱)

"کیا تمہاری نماز تمہیں اس بات کا حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادوں کے معبودوں کو چھوڑ دیں، یا اپنے اموال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنا ترک کر دیں؟"

وہ لوگ چونکہ "اموال" کو حقیقتہً "اپنا" (أموالنا) سمجھتے تھے، اس لیے "نفعل ما نشاء" (جو چاہیں کریں) کا دعویٰ اس کا لازمی نتیجہ تھا، یہی فکر سرمایہ داری کی روح ہے اور قرآن کریم نے سورۂ نور میں (اپنے اموال) "اموالنا" کے لفظ کو "مال اللہ" (اللہ کا مال) سے بدل کر سرمایہ دارانہ فکر کی اسی بنیاد پر ضرب لگائی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی "الذی اٰتاکم" (جو تمہیں دیا ہے) کی قید لگا کر اشتراکیت کی بھی جڑ کاٹ دی ہے جو سرے سے انسان کی انفرادی ملکیت ہی کا انکار کرتی ہے۔

اب اسلام، سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان واضح خطِ امتیاز اس طرح کھینچا جا سکتا ہے کہ:

سرمایہ داری ——— آزاد اور خود انفرادی ملکیت کی قائل ہے

اشتراکیت ——— انفرادی ملکیت کا سرے سے انکار کرتی ہے

اور حق ان دو انتہاؤں کے درمیان ہے۔ یعنی

اسلام ——— انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے، مگر یہ ملکیت آزاد اور خود مختار نہیں جس سے "فساد فی الارض" پھیل سکے۔

۳۔ تقسیم دولت کے اسلامی مقاصد

اسلام نے تقسیم دولت کا جو نظام مقرر کیا ہے، اور جس کا خاکہ ان شاء اللہ آگے پیش کیا جائے گا، قرآن کریم پر غور کرنے سے اس کے تین مقاصد معلوم ہوتے ہیں:

الف۔ ایک قابل عمل نظم معیشت کا قیام

تقسیم دولت کا سب سے پہلا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ دنیا میں معیشت کا ایک ایسا نظام نافذ کیا جائے جو فطری اور قابل عمل ہو، اور جس میں ہر انسان جبر و تشدد کے بجائے قدرتی طور پر اپنی لیاقت اپنی استعداد اپنے اختیار اور اپنی پسند کے مطابق خدمات انجام دے، تاکہ اس کی خدمات زیادہ مؤثر، مفید اور صحتمند ہوں، اور یہ بات "متاجر" (جسے مروجہ معاشی اصطلاح میں آجر کہا جاتا ہے) اور "اجیر" کے صحتمند رشتے اور "رسد" و "طلب" کی فطری قوتوں کے صحیح استعمال[1] کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس لئے اسلام نے انھیں تسلیم کیا ہے۔

اسی بات کی طرف مندرجۂ ذیل آیت میں جامع اشارہ فرمایا گیا ہے:

نَحۡنُ قَسَمۡنَا بَيۡنَهُمۡ مَّعِيۡشَتَهُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَرَفَعۡنَا بَعۡضَهُمۡ فَوۡقَ بَعۡضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَـتَّخِذَ بَعۡضُهُمۡ بَعۡضًا سُخۡرِيًّا

"ہم نے ان کے درمیان ان کی معیشت کو دنیوی زندگی میں تقسیم کیا ہے اور ان میں سے بعض کو بعض پر درجات کے اعتبار سے فوقیت دی ہے، تاکہ ان میں سے ایک دوسرے سے کام لے سکے۔" (۴۳: ۳۲)

ب۔ حق کا حقدار کو پہنچانا

اسلام کے نظام تقسیم دولت کا دوسرا مقصد حق کا حقدار کو پہنچانا ہے

[1] صحیح استعمال کی قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ ان قوتوں کا غلط استعمال بھی ممکن ہے، اور سرمایہ داری میں ہوتا رہا ہے۔ اسلام نے انفرادی ملکیت کی بے لگامی کو ختم کرکے اسی غلط استعمال کی بیخ کنی کی ہے۔

لیکن اسلام میں استحقاق کا معیار دوسرے نظام ہائے معیشت سے قدرے مختلف ہے۔ مادی معاشیات میں دولت کے استحقاق کا صرف ایک راستہ ہوتا ہے، اور وہ ہے عمل پیدائش میں شرکت۔ جتنے عوامل دولت کی پیداوار میں شریک ہوتے ہیں، انہی کو دولت کا مستحق سمجھا جاتا ہے، اور بس! اس کے برخلاف اسلام کا بنیادی اصول چونکہ یہ ہے کہ دولت اصلاً اللہ کی ملکیت ہے، اور وہی اس کے استعمال کے قوانین مقرر فرماتا ہے، اس لئے اسلام میں دولت کے حقدار صرف عاملین پیدائش ہی نہیں ہوتے بلکہ ہر وہ شخص بھی دولت کا مستحق ہے جس تک کا پہنچانا اللہ نے ضروری قرار دیا ہے۔ لہٰذا فقراء و مساکین اور معاشرے کے نادار اور بے کس افراد بھی دولت کے حقدار ہیں، اس لئے کہ جن عوامل پیدائش پر اولاً دولت تقسیم ہوتی ہے، ان کے ذمے اللہ نے لازم کیا ہے کہ وہ ان تک اپنی دولت کا کچھ حصہ پہنچائیں اور قرآنی تصریحات کے مطابق یہ مفلسوں اور ناداروں پر ان کا کوئی احسان نہیں ہے، بلکہ وہ فی الواقع دولت کے مستحق ہیں، ارشاد ہے:

فی أموالھم حقٌ معلوم للسائل والمحروم

"اور ان کے اموال میں سائل اور محروم کا ایک متعین حق ہے" (۷۰: ۲۴)

اسی حق کو بعض مقامات پر اللہ کا حق قرار دیا گیا ہے، کھیتیوں کے بارے میں فرمایا جاتا ہے:

وآتوا حقہ یوم حصادہ (۶: ۱۴۱)

"اور اس (کھیتی) کے کٹنے کے دن اس کا حق ادا کرو"

ان دونوں آیتوں میں "حق" کا لفظ ظاہر کر رہا ہے کہ استحقاق دولت کا مأخذ

صرف عمل پیدائش ہی نہیں ہے، بلکہ مفلس و نادار افراد بھی دولت کے ٹھیک اس طرح مستحق ہیں جس طرح اس کے اولین مالک۔

لہٰذا اسلام دولت کو اس طرح تقسیم کرنا چاہتا ہے کہ اس سے تمام عوامل پیدائش کو ان کے عمل کا حصہ بھی پہنچ جائے، اور اس کے بعد ان لوگوں کو بھی ان کا حصہ مل جائے جنھیں اللہ نے مستحق دولت قرار دیا ہے، (ان دونوں قسم کے حقداروں کی تفصیل آگے آرہی ہے)۔

ج- ارتکازِ دولت کی بیخ کنی

تقسیم دولت کا تیسرا مقصد جس کو اسلام نے بہت اہمیت دی ہے، یہ ہے، کہ دولت کا ذخیرہ چند ہاتھوں میں سمٹنے کے بجائے معاشرے میں زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے پر گردش کرے، اور اس طرح امیر و غریب کا تفاوت جس حد تک فطری اور قابلِ عمل ہو، کم کیا جائے۔ اس سلسلے میں اسلام کا طرزِ عمل یہ ہے کہ دولت کے جو اولین مآخذ اور ذرائع ہیں، ان پر اس نے کسی فرد یا جماعت کا پہرہ نہیں بیٹھنے دیا، بلکہ معاشرے کے ہر فرد کو ان سے استفادے کا مساوی حق دیا ہے، کانیں، جنگل، غیر مملوک، بنجر زمینیں، جنگل اور پانی کا شکار، خودرو گھاس، دریا اور سمندر، مالِ غنیمت وغیرہ یہ تمام پیدائشِ دولت کے اوّلین مآخذ ہیں، اور ان میں ہر فرد کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ان سے اپنے کسب و عمل کے مطابق فائدہ اٹھائے، اور اس پر کسی کی اجارہ داری قائم نہ ہو۔

كَيْلَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ (۵۹:۷)

لہ واضح رہے کہ یہ آیت مالِ غنیمت کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ وہ بھی حصول دولت کے اولین مآخذ میں سے ہے۔

تاکہ (یہ دولت) تم میں سے (صرف) مالداروں کے درمیان دائر ہو کر نہ رہ جائے۔

اس کے بعد جہاں انسانی عمل کی ضرورت پیش آتی ہے، اور کوئی شخص اپنے کسب وعمل سے کوئی دولت حاصل کرتا ہے تو وہاں اس کے کسب وعمل کا احترام کر کے اس کی ملکیت کو تسلیم کیا گیا ہے، اور اس میں ہر ایک کو اس کے کسب وعمل کے مطابق حصہ دیا گیا ہے، اور اس معاملے میں ارشاد یہ ہے کہ:

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا (۴۳: ۳۲)

"ہم نے ان کے درمیان ان کی معیشت کو تقسیم کیا ہے اور ان میں سے بعض کو بعض پر درجات کی فوقیت دی ہے۔ تاکہ ایک دوسرے سے کام لے سکے"

لیکن درجات کے اس فرق کے باوجود کچھ ایسے احکام دیدیئے گئے ہیں کہ یہ فرق اسی قدر رہے جتنا ایک قابلِ عمل نظامِ معیشت کے قیام کے لئے ضروری ہے، ایسا نہ ہو کہ دولت کا ذخیرہ صرف چند ہاتھوں میں سمٹا رہے۔

تقسیم دولت کے ان تین مقاصد میں سے پہلا مقصد اسلامی معیشت کو اشتراکیت سے ممتاز کرتا ہے، تیسرا مقصد سرمایہ دارانہ نظام سے، دوسرا دونوں سے، جس کی تفصیل عنقریب عرض کی جائے گی۔

تقسیم دولت کا اسلامی نظام

اسلامی نظامِ معیشت کے ان چند بنیادی اصولوں کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اب میں مختصراً "تقسیم دولت" کا وہ نظام بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں جو قرآن وسنت اور فقہاء امت کی کاوشوں سے سمجھ میں آتا ہے لیکن اس کو پوری

طرح سمجھنے کے لئے اُس کے بالمقابل دوسرے نظاموں اور نظریوں کا سامنے رکھنا بھی ضروری ہے جس کی تشریح یہ ہے۔

تقسیم دولت کا سرمایہ دارانہ نظریہ

سرمایہ دارانہ نظم معیشت میں "تقسیم دولت" کا جو نظام مقرر کیا گیا ہے، پہلے اس پر ایک نظر ڈال لینا مناسب ہوگا، مختصر لفظوں میں اس نظریئے کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے، کہ دولت اُنہی لوگوں پر تقسیم ہونی چاہیئے جنھوں نے اس کی پیداوار میں حصہ لیا ہے، اور جنھیں معاشی اصطلاح کے مطابق "عاملین پیداوار" کہا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ معاشیات میں یہ کل چار عوامل ہیں:

(۱) سرمایہ: جس کی تعریف "پیداکردہ ذریعۂ پیدائش" سے کی گئی ہے۔ یعنی وہ شے جس پر ایک مرتبہ انسانی عمل پیدائش ہوچکا ہو، اور اسے ایک دوسرے عمل پیدائش کے لئے ذریعہ بنایا جارہا ہو۔

(۲) محنت: یعنی انسانی عمل

(۳) زمین: جس کی تعریف "قدرتی وسائل" سے کی گئی ہے، یعنی وہ اشیاء جو انسان کے کسی سابقہ عمل پیدائش کے بغیر پیدائش کا وسیلہ بن رہی ہوں۔

(۴) آجر یا تنظیم: یعنی وہ چوتھا عامل جو مذکورہ بالا تینوں عوامل کو جوڑ کر انھیں کام میں لگاتا اور نفع و نقصان کا خطرہ مول لیتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظم معیشت میں ان چار عاملینِ پیدا وار کے مشترکہ عمل سے جو پیداوار ہوتی ہے، اس کو انہی چاروں پر اس طرح تقسیم کیا جاتا ہے کہ ایک حصہ

سرمایہ کو سود کی شکل میں دیا جاتا ہے، دوسرا حصّہ محنت کو اجرت کی شکل میں دیا ہے، تیسرا حصّہ زمین کو لگان یا کرایہ کی صورت میں ملتا ہے، اور چوتھا حصّہ آجر کے لئے منافع کی صورت میں باقی رکھا جاتا ہے۔

تقسیمِ دولت کا اشتراکی نظریہ

اس کے برخلاف اشتراکی معیشت میں چونکہ سرمایہ اور زمین کسی کی انفرادی ملکیت ہونے کے بجائے قومی ملکیت ہوتے ہیں، اس لئے سود اور لگان کا اس نظام کے فلسفے میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا[۱]۔ آجر بھی اشتراکی نظام میں کوئی فرد واحد ہونے کے بجائے خود حکومت ہوتی ہے، اس لئے منافع بھی اس کے یہاں نظری طور پر خارج از بحث ہے، اب صرف "محنت" رہ جاتی ہے، اور اشتراکی نظام میں دولت کی وہی مستحق ہے جو اسے "اجرت" کی شکل میں ملتی ہے۔

تقسیمِ دولت کا اسلامی نظریہ

اسلام کا نظامِ تقسیمِ دولت ان دونوں سے مختلف ہے، اس کے نزدیک دولت کے مستحقین دو قسم کے ہیں، ایک اوّلین مستحق یعنی وہ لوگ جو کسی عمل پیدائش کے بعد بلاواسطہ اس کے مستحق ہوتے ہیں، یہ مستحقین وہی عوامل پیدا وار ہیں جنھوں نے کسی پیداوار کے عمل پیدائش میں حصّہ لیا، دوسرے ثانوی مستحقین یعنی وہ لوگ

---

[۱] یہاں یہ واضح رہے کہ اس وقت گفتگو اشتراکیت کے اصل فلسفے سے ہو رہی ہے، اس کے موجودہ عمل سے نہیں، اشتراکی ممالک کا موجودہ طرزِ عمل اس فلسفے سے بہت مختلف ہے۔

جو براہ راست عمل پیدائش میں شریک نہیں تھے، لیکن عاملین پیدائش کے ذمے لازم کیا گیا ہے کہ وہ اپنی دولت میں ان کو بھی شریک کریں۔ یہاں مستحقین دولت کی ان دونوں قسموں کو ہم قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہیں :

دولت کے اولین مستحق

جیسا کہ عرض کیا گیا، دولت کے اولین مستحق عوامل پیداوار ہوتے ہیں، لیکن عوامل پیداوار کی تعیین، ان کی اصطلاحات اور ان پر تقسیم دولت کے طریقے اسلام میں بعینہٖ وہ نہیں ہیں جو سرمایہ دارانہ نظم معیشت میں مقرر کئے گئے ہیں، بلکہ بہت مختلف ہیں، اسلامی نظریئے کے مطابق پیدائش کے حقیقی عوامل چار کے بجائے تین ہیں :

(۱) سرمایہ : یعنی وہ وسائل پیداوار جن کا عمل پیدائش میں استعمال کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک خرچ نہ کیا جائے۔ اور اسی لئے ان کا کرایہ پر چلانا ممکن نہیں ہے، مثلاً نقد روپیہ، یا اشیائے خوردنی وغیرہ

(۲) زمین : یعنی وہ وسائل پیداوار جن کا عمل پیدائش میں اس طرح استعمال کیا جاتا ہے، کہ ان کی اصلی شکل وصورت برقرار رہتی ہے، اور اسی لئے انھیں کرایہ پر دیا جا سکتا ہے، مثلاً زمین، مکان، مشینری وغیرہ

(۳) محنت : یعنی انسانی فعل، خواہ وہ اعضاء وجوارح کا ہو، یا ذہن اور قلب کا۔ لہٰذا اس میں تنظیم اور منصوبہ بندی بھی داخل ہے۔

ان تین عوامل کے مشترکہ عمل سے جو پیداوار ہوگی، وہ اوّلاً انہی تینوں پر اس طرح

تقسیم کی جائے گی، کہ اس کا ایک حصّہ سرمایہ کو بشکل منافع (نہ کہ بشکل سود) ملے گا، دوسرا حصّہ زمین کو بشکل کرایہ دیا جائے گا، اور تیسرا حصّہ محنت کو بشکل اجرت ملے گا، جس میں جسمانی محنت اور تنظیم و منصوبہ بندی کی ذہنی اور فکری محنت سب داخل ہیں۔

اشتراکیت اور اسلام

تقسیمِ دولت کا یہ نظام اشتراکیت سے بھی مختلف ہے، اور سرمایہ داری سے بھی، اشتراکیت سے تو اس کا فرق بالکل ظاہر ہے کہ اشتراکیت میں چونکہ انفرادی ملکیت کا کوئی تصور ہی نہیں ہے، اس لئے اس میں تقسیم دولت صرف اُجرت کی شکل میں ہوتی ہے، اس کے برخلاف اسلامی نظریۂ تقسیم دولت کے جو اصول ہم نے شروع میں بیان کئے ہیں، ان کی روشنی میں کائنات کی تمام اشیاء اصلاً اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں، پھر ان اشیاء میں سے ایک کثیر حصّہ تو وہ ہے جسے اس نے وقفِ عام کے طور پر تمام انسانوں کو مساوی طور پر دے دیا ہے، آگ، پانی، مٹی، ہوا، روشنی، خودرو گھاس جنگل اور پانی کا شکار، معادن، اور غیر مملوک بنجر زمین وغیرہ اسی قسم میں داخل ہیں، جن پر کسی کی انفرادی ملکیت نہیں، بلکہ وہ وقفِ عام ہیں، ہر انسان ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، اور ان کا مساوی طور پر حقدار ہے۔

دوسری طرف بعض اشیاء وہ ہیں جن میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کئے بغیر وہ قابلِ عمل اور فطری نظم معیشت قائم نہیں ہو سکتا جس کی طرف ہم نے تقسیمِ دولت کے پہلے مقصد میں اشارہ کیا ہے، اشتراکی نظام کو اختیار کرتے ہوئے تمام سرمایہ اور

زمین کو کلیتہً حکومت کے حوالے کر دینے کا نتیجہ مآلِ کار اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ چھوٹے چھوٹے بیشمار سرمایہ داروں کو ختم کر کے ملکی دولت کے عظیم الشان ذخیرے کو ایک بڑے سرمایہ دار کے حوالہ کرنا پڑتا ہے۔ جو مِن ملنے طریقے پر دولت کے اس تالاب سے کھیلتا ہے، اور اس طرح اشتراکیت کا نتیجہ بدترین ارتکازِ دولت کی صورت میں سامنے آتا ہے، اس کے علاوہ اس سے دوسری بڑی خرابی یہ پیدا ہوتی ہے کہ انسانی محنت چونکہ اپنے اختیار اور مرضی کے فطری حق سے محروم ہو جاتی ہے، اس لئے اس کے استعمال کے لئے جبر و تشدد ناگزیر ہے، جس کا برا اثر محنت کی کارکردگی پر بھی پڑتا ہے، اور اس کی ذہنی صحت پر بھی، اس سے واضح ہو گیا، کہ اشتراکی نظام میں اسلامی نظریۂ تقسیم دولت کے دو مقاصد مجروح ہوتے ہیں، ایک فطری نظمِ معیشت کا قیام، اور دوسرے حقدار کو حق پہنچانا۔

غرض اشتراکیت کے غیر فطری نظام کی ان چند در چند خرابیوں کی وجہ سے اسلام نے انفرادی ملکیت کو سرے سے ختم کر ڈالنا پسند نہیں کیا، بلکہ کائنات کی جو اشیاء وقفِ عام نہیں ہیں، ان میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کر کے اس نے سرمایہ اور زمین کی جداگانہ حیثیت بھی برقرار رکھی ہے، اور ان میں "رسد و طلب" کے فطری نظام کو بھی صحتمند بنا کر استعمال کیا ہے۔ چنانچہ اس کے یہاں اشتراکیت کی طرح تقسیمِ دولت صرف اجرت کی شکل میں نہیں ہوتی، بلکہ منافع اور کرایہ کی صورت میں بھی ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس نے "سود" کی مد کو ختم کر کے اور دولت کے ثانوی مستحقین کی ایک طویل فہرست بنا کر ارتکازِ دولت کی اس زبردست خرابی کو بھی ختم کر دیا ہے جو سرمایہ داری کا خاصۂ لازمہ ہے۔ اور جسے دور کرنے کا دعوے اشتراکیت کرتی ہے۔

سرمایہ داری اور اسلام

یہ تھا اسلامی نظریہ تقسیم دولت کا وہ بنیادی فرق جو اسے اشتراکیت سے ممتاز کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس فرق کو بھی اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے جو سرمایہ داری اور اسلام کے نظام تقسیم دولت میں پایا جاتا ہے۔ یہ فرق چونکہ قدرے دقیق اور پیچیدہ ہے اس لئے اسے نسبتہً زیادہ تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت ہوگی۔

اوپر ہم نے اسلام اور سرمایہ داری کے نظام تقسیم دولت کے جو اجمالی خاکے پیش کئے ہیں۔ ان کا تقابل کرنے سے اسلام اور سرمایہ داری کے درمیان مندرجہ ذیل فرق واضح ہوتے ہیں:

(۱) عوامل پیداوار کی فہرست سے آجر کو مستقل عامل ہونے کی حیثیت سے ختم کر دیا گیا ہے اور صرف تین عوامل پیداوار تسلیم کئے گئے ہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ آجر کے وجود سے انکار کیا گیا ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ کوئی الگ عامل نہیں، بلکہ ان تین عوامل میں سے کسی نہ کسی میں شامل ہے۔

(۲) سرمایہ کا صلہ "سود" کے بجائے "منافع" قرار دیا گیا ہے۔

(۳) عوامل پیدائش کی تعریفیں بدل دی گئی ہیں۔ "سرمایہ" کی تعریف سرمایہ دارانہ معیشت میں پیدا شدہ ذریعہ پیدائش "سے کی جاتی ہے، لہٰذا نقد روپیہ اور اشیائے خوردنی کے علاوہ مشینری وغیرہ بھی اس میں داخل ہے۔ لیکن ہم نے اسلامی نظریہ تقسیم دولت کی توضیح کرتے ہوئے "سرمایہ" کی جو تعریف بیان کی ہے اس میں صرف وہ چیزیں شامل ہیں جنھیں خرچ کئے بغیر ان سے استفادہ ممکن نہیں؛

یا بالفاظ دیگر جنھیں کرایہ پر نہیں چلایا جاسکتا، مثلاً روپیہ لہذا مشینری اس تعریف کی رُو سے "سرمایہ" میں داخل نہیں۔

(۴) اسی طرح "زمین" کی تعریف زیادہ عام کردی گئی ہے۔ یعنی اس میں ان تمام چیزوں کو شامل کر لیا گیا ہے جن سے استفادہ کے لئے انھیں خرچ کرنا نہیں پڑتا، لہٰذا مشینری بھی اس میں داخل ہوگئی ہے۔

(۵) محنت کی تعریف میں بھی زیادہ عموم پیدا کر دیا گیا ہے، اور اس میں ذہنی محنت تنظیم اور منصوبہ بندی بھی شامل ہو گئی ہے۔

آجر سرمایہ ور محنت سے الگ نہیں

اسلام کے نظریۂ تقسیم دولت کے مذکورہ بالا امتیازات میں سب سے بڑا اور بنیادی امتیاز یہ ہے کہ اس نے آجر اور سرمایہ کی تفریق ختم کردی ہے، جس کے نتیجے میں تقسیم دولت کے تین مد قرار پائے ہیں، منافع، اجرت اور کرایہ، چوتھے مد یعنی سُود کو ناجائز قرار دیدیا گیا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں "آجر" کی سب سے بڑی خصوصیت جس کی بنا پر اسے "منافع" کا مستحق قرار دیا گیا ہے، یہ بتلائی جاتی ہے کہ وہ کاروبار کے نفع و نقصان کا خطرہ برداشت کرتا ہے، گویا سرمایہ دارانہ نقطۂ نظر سے "منافع" اس کی اس ہمت کا صلہ ہے کہ اس نے ایک ایسی کاروباری مہم کا آغاز کیا جس میں اگر نقصان ہو جائے تو وہ تن تنہا اسی پر پڑے گا، باقی تینوں عوامل پیدا وار میں سے سرمایہ کو معین سود، زمین کو معین لگان اور محنت کو معین اجرت

ل جاتی ہے۔ اس لئے وہ نقصان سے بری ہیں۔

اسلام کا نقطۂ نظریہ ہے کہ درحقیقت۔ نقصان کا خطرہ مول لینے کی صفت خود سرمایہ میں موجود ہونی چاہئے۔ اس خطرے کا بار کسی اور پر نہیں ڈالا جا سکتا جو شخص کسی کاروبار میں اپنا سرمایہ لگانا چاہتا ہے، اسی کو یہ خطرہ مول لینا پڑے گا۔ اس لئے جو سرمایہ دار ہے، وہی خطرہ مول لینے کے لحاظ سے آجر بھی ہے۔ اور جو شخص آجر ہے وہی سرمایہ دار بھی ہے۔

اب سرمایہ کے کسی کاروبار میں لگنے کی تین صورتیں ہیں:

(۱)۔ انفرادی کاروبار

سرمایہ لگانے والا بلا شرکتِ غیرے خود ہی کاروبار بھی چلائے اس صورت میں اس کو جو صلہ ملے گا وہ خواہ عرفی اور قانونی اعتبار سے صرف "منافع" کہلائے لیکن معاشی اصطلاح کے مطابق وہ صلہ دو چیزوں کا مجموعہ ہوگا، سرمایہ لگانے کی وجہ سے "منافع" کا، اور کاروبار چلانے کی محنت کے لحاظ سے اجرت کا۔

(۲) شرکت

دوسری صورت یہ ہے کہ کئی آدمی مل کر سرمایہ لگائیں، کاروبار چلانے میں بھی سب شریک ہوں اور نفع و نقصان میں بھی اسے فقہی اصطلاح میں شرکۃ العقود کہا جاتا ہے۔ اس صورت میں بھی معاشی اصطلاح کے مطابق تمام شرکاء سرمایہ لگانے کی حیثیت سے "منافع" کے حقدار ہوں گے، اور کاروبار چلانے کی حیثیت سے "اجرت" کے۔

یہ صورت بھی اسلام نے جائز قرار دی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل تجارت کا یہ طریقہ رائج تھا، آپؐ نے لوگوں کو اس پر برقرار رکھا، اور اس کے جواز پر اجماع منعقد ہو گیا۔[۱]

۳- مضاربت

تیسری صورت یہ ہے، کہ ایک شخص سرمایہ لگائے، اور دوسرا کاروبار چلائے اور نفع میں دونوں شریک ہوں، اسے فقہی اصطلاح میں "مضاربت" کہا جاتا ہے، اس صورت میں معاشی اصطلاح کے مطابق سرمایہ لگانے والے (رب المال) کو اس کا حصہ "نفع" کی صورت میں ملے گا، اور کاروبار چلانے والے (مضارب) کو "اجرت" کی صورت میں، ہاں اگر کاروبار میں نقصان ہو جائے تو جس طرح رب المال کا سرمایہ بیکار گیا، اسی طرح مضارب کی محنت بیکار رہی۔

یہ صورت بھی اسلام میں جائز ہے، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہؓ کے ساتھ نکاح سے قبل یہی معاملہ فرمایا تھا[۲] اس کے بعد اس کے جواز پر بھی فقہاء امت کا اجماع منعقد ہو چکا ہے[۳]

ان تینوں صورتوں کے سوا کاروبار میں سرمایہ کے شریک ہونے کی اسلام میں کوئی اور صورت نہیں ہے۔

سود کا کاروبار

تشغیل سرمایہ کی چوتھی صورت جو غیر اسلامی معاشروں میں شروع سے

---

[۱] ملاحظہ ہو المبسوط للسرخسیؒ ص ۱۵۱ ج ۱۱ مطبع السعادۃ مصر

[۲] زرقانیؒ: شرح المواھب ص ۱۹۸ ج اول الازھر مصر ۱۳۲۵ھ

[۳] المبسوط للسرخسیؒ ص ۱۸ ج ۲۲

رائج چلی آتی ہے، سود کا کاروبار ہے یعنی ایک شخص سرمایہ بطور قرض دے، دوسرا محنت کرے، نقصان ہو تو محنت کا ہو، اور سرمایہ کا سود ہر صورت میں کھرا ہے، اس کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

یاایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ و ذروا ما بقی من الربوا ان کنتم مومنین فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ

"اے ایمان والو! سود میں سے جو کچھ باقی رہ گیا ہو، اسے چھوڑ دو، اگر تم مومن ہو، پس اگر تم ایسا نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لو۔" (۲:۲۷۸)

اس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے، کہ

فان تبتم فلکم رؤس اموالکم لا تظلمون ولا تظلمون

پس اگر تم (سود سے) توبہ کرو تو تمہیں تمہارے اصل اموال مل جائیں گے نہ تم کسی پر ظلم کرو، نہ کوئی تم پر ظلم کرے۔ (۲:۲۷۸)

ان دو آیتوں میں "ما بقی من الربوا" اور "فلکم رؤس اموالکم" کے الفاظ نے پوری وضاحت کے ساتھ یہ بات صاف کر دی ہے کہ سود کی ادنیٰ سے رکا باقی رہنا بھی اللہ کو گوارا نہیں ہے، اور سود کو چھوڑنے کا مطلب یہ ہے رِن دینے والے کو صرف "رأس المال" واپس ملے، لہذا اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ اسلام کی نظر میں صفر کے سوا سود کی ہر شرح نامعقول ہے۔

جاہلیت میں بعض قبائل عرب دوسرے قبیلوں سے سود پر قرض لے کر کاروبار کرتے تھے، اسلام نے ان تمام معاملات کو یکسر موقوف کر دیا، ابن جریج فرماتے ہیں:

كانت بنو عمرو بن عمير بن عوف ياخذون الربا من بني المغيرة وكانت بنو المغيرة يربون لهم في الجاهلية فجاء الإسلام ولهم عليهم مال كثير،

"جاہلیت میں بنو عمرو بن عمیر بنو المغیرہ سے سود لیا کرتے تھے اور بنو مغیرہ انھیں سود دیتے تھے، جب اسلام آیا تو ان کا ان پر بہت سارا مال واجب تھا"۔ —————— اور:

كان بنو المغيرة يربون لثقيف [1]

بنو مغیرہ بنو ثقیف کو سود دیا کرتے تھے

واضح رہے کہ قبائل عرب کی حیثیت مشترکہ کمپنیوں کی سی تھی جو افراد کے مشترک سرمایہ سے کاروبار کرتی تھیں، اس لئے ایک قبیلے کا اجتماعی طور پر قرض لینا عموماً کاروبار کے لئے ہوتا تھا، اور اس کو بھی قرآن کریم نے ممنوع قرار دیدیا۔

غرض اسلامی نظام معیشت میں جو شخص کسی کاروباری آدمی کو اپنا روپیہ کاروبار میں لگانے کے لئے دینا چاہتا ہے اسے پہلے یہ متعین کرنا پڑے گا کہ وہ یہ روپیہ کاروبار کے نفع میں خود حصہ دار ہونے کے لئے دے رہا ہے، یا وہ اس روپیہ سے اس کاروباری آدمی کی امداد کرنا چاہتا ہے، اگر اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ روپیہ دے کر کاروبار کے نفع سے مستفید ہو تو اسے "شرکت" یا "مضاربت" کے طریقوں پر عمل کرنا پڑے گا، یعنی اسے کاروبار کے نفع و نقصان کی ذمہ داری بھی اٹھانی پڑیگی کاروبار کو نفع ہوا تو وہ نفع میں شریک ہوگا، اور اگر کاروبار کو خسارہ ہوا تو اسے

---

[1] تفسیر الدر المنثور بحوالہ ابن جریر ص ۳۶۶ جلد اول

خسارے میں بھی حصہ دار ہونا پڑے گا۔

اور اگر وہ روپیہ دوسرے کی امداد کی غرض سے دے رہا ہے تو پھر ضروری ہے کہ وہ اس امداد کو امداد ہی سمجھے اور "نفع" کے ہر مطالبے سے دستبردار ہوجائے وہ صرف اتنے ہی روپے کی واپسی کا مستحق ہوگا جتنے اس نے قرض دیئے تھے، اسلام کی نظر میں اس ناانصافی کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ وہ اپنے "سود" کی ایک شرح معین کرکے نقصان کا بوجھ مقروض پر ڈال دے۔

اس تفصیل سے واضح ہوگیا کہ اسلام میں "نقصان کا خطرہ مول لینے" کی ذمہ داری "سرمایہ" پر ہے، جو شخص کاروبار میں سرمایہ لگائے گا، اسے یہ خطرہ ضرور مول لینا پڑے گا، اگر کسی شخص نے قرض حسن لے کر کاروبار میں سرمایہ لگایا ہے، اور دائن کے ساتھ شرکت یا مضاربت کا معاملہ نہیں کیا تو قرض لینے کے بعد مدیون خود اس روپے کا مالک ہوگیا، اب وہ خود سرمایہ دار کی حیثیت سے روپیہ لگا رہا ہے، اس لئے نقصان کی ذمہ داری بھی اسی پر ہوگی

لہٰذا اگر "آجر" کی بنیادی خصوصیت یہ ہے (جیساکہ بیشتر ماہرین معاشیات کا خیال ہے) کہ وہ "خطرہ مول لیتا ہے"، تو یہ خصوصیت اسلام کی نظر میں درحقیقت "سرمایہ" کی ہے، اس لئے اسلامی نظام معیشت میں سرمایہ اور اصطلاحی آجر ایک ہی چیز ہوجاتے ہیں، اور تقسیم دولت میں ان کا حصہ منافع ہے نہ کہ سود، اور اگر "آجر" کی بنیادی خصوصیت یہ سمجھی جائے کہ وہ تنظیم اور منصوبہ بندی کرتا ہے (جیساکہ بعض ماہرین معاشیات کا خیال ہے) تو پھر یہ کام "محنت" میں داخل ہے، اور اُسے عامل پیداوار سمجھنا طول لاطائل اور نامعقول ہے۔

کرایہ اور سود کا فرق

مذکورہ بحث سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اسلام کی رُو سے منافع اور اجرت جائز ہے، اور سود ناجائز، اب چوتھی چیز "کرایہ" رہ جاتی ہے، اسلام نے اسے بھی جائز قرار دیا ہے، بعض حضرات کو یہاں یہ اشکال ہونے لگتا ہے کہ جب سرمایہ پر سود کا لین دین معین ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے تو زمین کا کرایہ (واضح رہے کہ ہماری اصطلاح میں زمین کے اندر مشینری وغیرہ بھی داخل ہے) کیوں جائز ہے جبکہ وہ بھی معین ہوتا ہے؟

اس سوال کے جواب کے لئے پہلے یہ سمجھنا چاہیئے کہ معیشت کے مادی وسائل دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک تو وہ جنھیں استعمال کرنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کے لئے انھیں خرچ کرنا نہیں پڑتا، بلکہ وہ اپنا وجود برقرار رکھتے ہوئے فائدہ دیتے ہیں، مثلاً زمین، مشینری، فرنیچر، سواری وغیرہ کہ ان کے وجود کو باقی رکھتے ہوئے ان سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے، ان سے مستفید ہونے کے لئے خرچ یا فنا کرنا نہیں پڑتا، ایسی چیزیں چونکہ بذاتِ خود قابل استفادہ ہوتی ہیں اور ان کے بہت سے فوائد وہ ہیں جنھیں حاصل کرنے کے لئے کرایہ لینے والے کو ذرہ برابر محنت نہیں کرنی پڑتی، دوسری طرف ان کے استعمال سے ان کی قدر گھٹتی ہے، اس لئے ان کے "منافع" کی اجرت کا لین دین بالکل معقول اور درست ہے، اور اسی "منافع کی اجرت" کو اسلام "کرایہ" کہتا ہے۔

اس کے برخلاف نقد روپیہ وہ چیز ہے جس سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے اسے خرچ یا فنا کرنا پڑتا ہے اس سے کسی قسم کا فائدہ تک نہیں اٹھایا جا سکتا جب تک کہ اس سے کوئی چیز خریدی نہ جائے، لہٰذا روپیہ چونکہ بذات خود قابل

استفادہ نہیں ہوتا، اس لئے ایک طرف تو اس سے جس قسم کا فائدہ بھی مقروض اٹھانا چاہے، اسے خرچ کر کے خود کچھ عمل کرنا پڑتا ہے، دوسری طرف مقروض کے استعمال کی وجہ سے روپیہ کی قدر میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، اس لئے اس پر کوئی معین "شرح سود" مقرر کرنے میں کوئی معقولیت نہیں ہے، روپیہ کے مالک کو اختیار ہے کہ وہ چاہے تو قرض نہ دے، یا چاہے تو اس کے ذریعہ روپے کے حاجتمند کے ساتھ شرکت و مضاربت کا کاروبار کرے، لیکن اگر وہ قرض دیتا ہے تو اس پر معین "شرح" سے سود لینے کی اسلام اجازت نہیں دے سکتا۔

اسی بنا پر ہم نے یہ اصطلاح مقرر کی ہے کہ جو چیزیں بذات خود خرچ کئے بغیر قابل استفادہ نہیں ہوتیں وہ "سرمایہ" کہلائیں گی، اور جب وہ عامل پیداوار کی حیثیت سے کاروبار میں شریک ہوں گی تو "منافع" کی مستحق ہوں گی، اور جو چیزیں خرچ کئے بغیر قابل استفادہ ہوتی ہیں، وہ "زمین" کہلائیں گی، اور عمل پیدائش میں حصہ دار ہونے کی وجہ سے انھیں "کرایہ" کی صورت میں دولت تقسیم کی جائے گی۔

حرمتِ سُود کا اثر تقسیمِ دَولت پر

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ اسلام اور سرمایہ داری کے نظام تقسیم دولت میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معاشیات میں "سود" جائز ہے، اور اسلام میں ناجائز، اب مختصراً اس پہلو پر نظر ڈال لینا بھی مناسب ہو گا کہ حرمتِ سود کے معاشی اثرات کیا ہیں؟

یوں تو "سود" کی حرمت سے "پیدائش دولت" کے نظام پر بھی بڑے

گہرے، دوررس اور مفید اثرات مرتب ہوتے ہیں، لیکن یہاں یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے، اس لئے اس کے صرف ان اثرات کی طرف مجمل اشارے عرض کئے جاتے ہیں جو "تقسیم دولت" کے نظام پر مرتب ہوتے ہیں:

حرمتِ سود کا ایک سادہ اثر تو یہ ہے، کہ اس کی وجہ سے تقسیم دولت کے نظام میں توازن اور ہمواری پیدا ہو جاتی ہے، سودی نظامِ معاشیات کا خاصۂ لازمہ ہے کہ اس میں ایک فریق (سرمایہ) کا نفع تو معین صورت میں بہرحال کھرا رہتا ہے، لیکن اس کے مقابل دوسرے فریق (محنت) کا نفع مشتبہ اور موہوم رہتا ہے، وسیع پیمانے کی تجارتیں خواہ کتنی ہی نفع بخش کیوں نہ ہو جائیں، لیکن انھیں بہرحال "خطرے" سے خالی نہیں کہا جا سکتا، بلکہ جہاں موجودہ وسائل معیشت کی فراوانی سے بڑے پیمانے کی تجارتوں کے خطرات کم ہوئے ہیں، وہاں کچھ خارجی عوامل کی بنا پر ان میں اضافہ بھی ہوا ہے، اور تجارت جتنے بڑے پیمانے کی ہوتی ہے، یہ خطرات بھی اتنے ہی وسیع ہو جاتے ہیں، اس لئے سرمایہ دارانہ معیشت میں تقسیم دولت کا توازن نہایت ناہموار ہو جاتا ہے، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قرض لینے والے کو سخت نقصان اٹھانا پڑا، لیکن قرض دینے والے کی تجوری بھرتی ہی چلی گئی، اور کبھی اس کے برعکس یہ ہوتا ہے کہ تاجر کو بے انتہا منافع ہوا، اور سرمایہ دینے والے کو اس میں سے بہت معمولی سا حصہ مل سکا۔

اس کے برخلاف اسلامی نظام میں چونکہ سود حرام ہے، اس لئے موجودہ دنیا میں عموماً شغل سرمایہ کی دو صورتیں ہوں گی، شرکت اور مضاربت اور یہ دونوں صورتیں تقسیم دولت کی اس غیر منصفانہ ناہمواری سے خالی ہیں، ان صورتوں میں نقصان ہوتا ہے، تو فریقین کو ہوتا ہے، اور نفع ہوتا ہے تو دونوں فریق متناسب طریقے سے اس

سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

"ارتکاز دولت جو سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی بدترین خرابی ہے، اس طریقے کی بدولت اس کی بڑی حد تک مؤثر روک تھام ہو جاتی ہے، اور دولت کا ذخیرہ چند ہاتھوں میں سمٹنے کے بجائے معاشرے کے افراد میں اس طرح پھیلتا ہے کہ اس سے کسی شخص پر کوئی ظلم نہیں ہو پاتا۔ وجہ یہ ہے، کہ سرمایہ دارانہ معیشت میں ارتکاز دولت کی ایک بہت بڑی وجہ "سود" ہے، اسی وجہ سے مٹھی بھر سرمایہ دار نہ صرف یہ کہ دولت کے بڑے خزانے پر قابض ہو جاتے ہیں، بلکہ وہ پورے بازار پر بھی پوری خودغرضی کے ساتھ حکمرانی کرتے ہیں، اس کے نتیجے میں "رسد اشیاء" اور "قیمتوں" کا نظام بھی قدرتی رہنے کے بجائے مصنوعی ہو جاتا ہے، اور معیشت و اخلاق سے لیکر ملکی سیاست تک زندگی کا کوئی گوشہ اس کے بُرے اثرات سے محفوظ نہیں رہتا۔

اسلام نے "سود" کو ممنوع قرار دے کر ان تمام خرابیوں کی بنیاد کو منہدم کر دیا ہے، اسلامی نظام میں ہر روپیہ لگانے والا کاروبار اور اس کی پالیسی میں شریک ہوتا ہے، نفع و نقصان کی ذمہ داریاں بھی اٹھاتا ہے، اور اس طرح اس کی کاروباری مرضی بے لگام نہیں ہونے پاتی۔

ایک شبہ اور اُس کا ازالہ

یہاں ایک شبہ کا ازالہ کر دینا مناسب ہوگا، "سود" کے نقصانات کے بارے میں جو یہ کہا گیا ہے کہ اس کی وجہ سے تقسیم دولت میں ناہمواری پیدا ہوتی ہے، اور فریقین میں سے کوئی نہ کوئی اس سے متاثر ہوتا ہے۔ اس پر بعض حضرات کے دل

میں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے، کہ سودی کاروبار میں جس شخص کو بھی نقصان پہنچتا ہے
وہ اس کی مرضی سے پہنچتا ہے، اور جب وہ خود یہ خطرہ مول لینے پر راضی ہے تو اس میں
قانون شریعت کیوں دخل انداز ہوتا ہے؟ حالانکہ ذرا سا غور کیا جائے تو اس کا جواب سمجھنا
کوئی مشکل نہیں، اسلامی نظام زندگی کا معمولی سا مطالعہ بھی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی
ہے کہ اسلام میں فریقین کی باہمی رضامندی ہمیشہ کسی معاملے کی وجہ جواز نہیں ہوتی۔ اگر
کوئی شخص دوسرے کے ہاتھوں قتل ہو جانے پر راضی ہو تو یہ بات قاتل کو بری نہیں کر سکتی یہاں
تک کہ "زنا" جسے مغربی تہذیب کی تنگ نظری نے خالص نجی زندگی کا مسئلہ سمجھا ہوا ہے اس میں بھی فریقین
کی رضامندی مجرموں کو بری نہیں کر سکتی، دولت کی تقسیم اور معاشی نظام کی بہبود کا معاملہ تو
اس سے کچھ آگے ہی ہے! شروع میں قرآن کریم کے حوالوں سے عرض کیا جا چکا ہے
کہ دولت اصلاً اللہ کی ملکیت ہے، اور اس نے انسان کو جو ملکیت عطا کی ہے، وہ آزاد
اور بے لگام ہونے کی بجائے اصولوں کی پابند ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر وہ معاملہ جو اسلام
کی نظر میں فی نفسہ غیر منصفانہ ہے اور اس کا اثر معاشرے کی اجتماعی بہتری پر پڑ سکتا ہے
اس میں اسلام نے فریقین کی رضامندی کو وجہ جواز قرار نہیں دیا، سود، قمار، رشوت
اور بے حیائی کے سب کام اگرچہ فریقین کی پوری رضامندی سے ہوں شریعت
اسلام نے ان سب کو اسی لئے حرام قرار دیا ہے کہ ان کا فساد پورے انسانی معاشرے
کو متاثر کرتا ہے جس کا حق کسی فرد یا افراد کو نہیں دیا جا سکتا۔

احادیث میں فریقین کی رضامندی کے باوجود "تلقی الجلب[1]"

---

[1] قدیم رسم تھی کہ سرمایہ دار لوگ دیہات کے غلہ کو بازار میں آنے سے پہلے دیہات میں پہنچ کر خرید لیتے اور ذخیرہ کر کے قیمت میں من مانی زیادتی کرتے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منع فرمایا اسی کا نام "تلقی الجلب" ہے ۱۲

"بیع الحاضر لباد[1]"، "محاقلہ[2]"، "مزابنہ اور" مخابرہ" وغیرہ کی شدید ممانعت آئی ہے، اس کے پیچھے یہی حکمت کار فرما ہے اسلئے "سود" کے معاملے کو بھی محض اس بنا پر جائز قرار نہیں دیا جا سکتا کہ فریقین اس پر رضامند ہیں،

جاہلیت کے لوگ حرمتِ سود پر اسی قسم کا اعتراض کیا کرتے تھے کہ:۔

انما البیع مثل الربوا (۲: ۲۷۵)

"بیع ربوا ہی کی طرح تو ہے"

قرآن کریم نے مختصر لفظوں میں اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ:

واحل اللہ البیع وحرم الربوا (۲: ۲۷۵)

"اور اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور ربا کو حرام"

یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اعتراض کے جواب میں "حرمت سود" کی کوئی حکمت اور مصلحت نہیں بیان فرمائی، بلکہ صرف یہ فرمایا ہے جب اللہ نے بیع کو حلال اور ربوا کو حرام کر دیا ہے تو خواہ مصلحت تمہاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے، اس حکم کو ماننا پڑے گا، یہاں قرآن کریم نے حکمتوں کو بیان فرمانے کے بجائے حاکمانہ اسلوب اختیار فرمایا ہے جس سے حرمتِ سود پر ہر قسم کے اعتراض کی جڑ کٹ جاتی ہے

خلاصہ یہ ہے کہ "سود کی حرمت" اسلام کا وہ حکیمانہ فیصلہ ہے جس کی وجہ سے سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت کی بہت سی خرابیاں بھی دور ہو جاتی ہیں، اور اس کے بعد

---

[1] آڑھت کا کام کرنے والے دیہات کا غلہ اپنے پاس ذخیرہ کر کے گراں قیمت پر فروخت کریں، اس کے انسداد کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر والوں کو گاؤں والوں کا دلال بننے سے منع فرما دیا ۱۲ منہ

[2] یہ تینوں قسمیں بیع فاسد کی ہیں جن میں ایک فریق کو نقصان کا خطرہ رہتا ہے اس کو بھی باوجود رضامندیٔ فریقین منع کر دیا گیا ۱۲ منہ

اشتراکیت کے مستبد اور غیر فطری نظام معیشت کو اختیار کرنیکی بھی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی یہی وہ اعتدال کی راہ ہے جو موجودہ دنیا کو افراط و تفریط سے نجات دلاکر ایک متوازن اور منصفانہ نظامِ معیشت کی طرف رہنمائی کر سکتی ہے، فرانسیسی پروفیسر لوئی ماسین یون نے بڑی سچی بات کہی ہے کہ:

"سرمایہ داری اور اشتراکیت کے تصادم میں اسی تمدن اور تہذیب کا مستقبل محفوظ اور درخشاں رہے گا جو سود کو ناجائز قرار دے کر اس پر عمل بھی کر رہا ہو۔"[1]

اجرتوں کا مسئلہ

یہاں تک تقسیم دولت کے معاملے میں اسلام اور سرمایہ داری کا ایک بنیادی فرق واضح ہوا ہے، اور وہ ہے مسئلہ سود! اس کے بعد ان دونوں کے درمیان ایک اور فرق کو ذہن میں رکھنا بھی ضروری ہے، جو آجر اور اجیر کے رشتے سے متعلق ہے، اور جس میں اجرتوں کا مسئلہ زیر بحث آتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف موجودہ دنیا میں جو شدید ردّ عمل ہوا ہے، اس کی بہت بڑی وجہ آجر اور اجیر کے جھگڑے اور اجرتوں کی تعیین کے مسائل تھے، سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی بنیاد ہی چونکہ خود غرض اور بے لگام انفرادی ملکیت پر ہے، اس لئے اس نظام میں آجر اور اجیر کے درمیان "رسد و طلب" کا ایک ایسا خشک، کھردرا اور رسمی تعلق ہے، جس کی بنیاد خالص خود غرضی پر استوار ہوتی ہے، آجر صرف اس حد تک اجیر کی انسانیت

---

[1] ڈاکٹر یوسف الدین: اسلام کے معاشی نظریے ص ۲۸۴ ج ۲ بحوالہ ڈاکٹر حمید اللہ: انجمن برائے قرضہ حسنہ کی اہمیت، مجلہ طیلسانیین عثمانیہ ج ۲، حصہ معاشیات ج ۲ ۱۹۴۳ء

کا احترام کرتا ہے، جب تک وہ اپنے کاروبار کیلئے اس کے ہاتھوں مجبور رہے، لہٰذا جہاں یہ مجبوری ختم ہو جاتی ہے، وہاں وہ اس پر اپنے ظلم کا شکنجہ کس دیتا ہے، دوسری طرف اجیر صرف اس وقت تک آجر کے کام اور اس کے احکام سے دلچسپی رکھتا ہے، جب تک اس کا روزگار کسی آجر پر موقوف ہو، لہٰذا جہاں اس کی یہ مجبوری ختم ہو جاتی ہے، وہاں وہ کام چوری اور ہڑتال سے نہیں چوکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مزدور اور سرمایہ دار میں ایک ابدی کشمکش قائم رہتی ہے، اور دونوں کے درمیان کوئی صحت مند رابطہ قائم نہیں ہو پاتا۔

اس کے برخلاف اسلام نے اگرچہ آجر اور اجیر کے درمیان رسد اور طلب کے نظام کو ایک حد تک تسلیم کیا ہے، لیکن ساتھ ہی محنت کی رسد اور طلب دونوں پر کچھ ایسی پابندیاں عائد کر دی ہیں کہ ان کا باہمی رابطہ ایک خشک رسمی تعلق نہیں رہا، بلکہ بڑی حد تک بھائی چارہ بن گیا ہے، آجر کا نقطۂ نظر اجیر کے بارے میں کیا ہونا چاہئے؟ اس کو قرآن کریم نے حضرت شعیبؑ کا ایک مقولہ نقل فرماتے ہوئے مختصر لفظوں میں واضح فرما دیا ہے، حضرت شعیب علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے "آجر" تھے، اور انھوں نے فرمایا:

وَمَا أُرِيدُ أَنْ أَشُقَّ عَلَيْكَ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّالِحِينَ

میں تم پر (غیر ضروری) مشقت ڈالنا نہیں چاہتا، خدا نے چاہا تو تم مجھے نیکو کار پاؤ گے۔ (۲۸: ۲۷)

اس آیت نے واضح فرما دیا کہ ایک مسلمان آجر جس کی اصل منزل مقصود "صالح" ہوتا ہے، اس وقت تک "صالح" نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے اجیر کو غیر ضروری مشقت سے بچانے کا داعیہ نہ رکھتا ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو مزید واضح الفاظ میں اس طرح کھول دیا ہے کہ:

اِنَّ اِخوانکم خولکم جعلھم اللہ تحت اَیدیکم فمَن کان اخوہ
تحت یدہٖ فلیطعمہ مما یاکل ولیُلبسہ مما یلبس، ولا تکلفوھم
مَا یغلبھم، فاِن کلفتموھم مایغلبھُم فاَعینوھُم [۱]

"تمہارے بھائی تمہارے خادم ہیں جنھیں اللہ نے تمہارے زیر دست کیا ہے
لہٰذا جس شخص کا بھائی اس کے ماتحت ہو اسے چاہیے کہ وہ جو خود کھائے
اسی میں سے اس کو بھی کھلائے، اور جو خود پہنے اسی میں سے اس کو بھی
پہنائے، اور ان پر کسی ایسے کام کا بوجھ نہ ڈالو جو ان کی طاقت سے زیادہ
ہو، اور اگر کسی ایسے کام کا بوجھ ڈالو تو خود ان کی مدد کرو۔"

نیز ارشاد فرمایا کہ:

اَعطوا الاَجیرَ اَجرہٗ قبلَ اَن یجف عرقہ [۲]

"مزدور کی اجرت اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کردو۔"

اسی طرح آپؐ کا ارشاد ہے کہ تین شخص ایسے ہیں جن کا میں قیامت کے دن دشمن ہونگا
ان میں سے ایک وہ ہے کہ:

رجلٌ استاجر اَجیرًا فاستوفیٰ منہ ولم یعطہ اَجرہ [۳]

"وہ شخص جو کسی مزدور کو اجرت پر لے، پھر اس سے کام پورا لے لے، اور اس
کو اس کی اجرت نہ دے۔"

---

[۱] صحیح بخاری کتاب العتق ص ۳۴۶ ج اول
[۲] ابن ماجہؒ و طبرانیؒ عن ابن عمرؓ و جمع الفوائد ص ۲۵۹ جلد اول میرٹھ ۱۳۴۵ھ
[۳] صحیح بخاری کتاب الاجارۃ بروایت ابو ہریرہؓ ص ۳۰۲ جلد اول

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مزدوروں کے حقوق کا کس قدر احساس تھا؟ اس کا اندازہ حضرت علیؓ کی اس روایت سے ہوتا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ وفات سے قبل آپؐ کے آخری الفاظ یہ تھے:

الصلوٰۃ وما ملکت ایمانکم [1]

"نماز کا خیال رکھو، اور ان لوگوں (کے حقوق) کا جو تمہارے زیر دست ہیں۔"

ان ہدایات کے نتیجے میں "مزدور" کو اسلامی معاشرے میں جو باوقار اور برادرانہ مقام حاصل ہوا، اس کی بیشمار مثالیں قرون اولیٰ کی اسلامی تاریخ میں ملتی ہیں۔ اور پورے وثوق اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ "مزدور" کے حقوق کی رعایت اس سے بہتر طریقے پر ممکن ہی نہیں ہے۔

دوسری طرف اسلام نے "اجیر" کو بھی کچھ احکام کا پابند بنا کر آجر سے اس کے تعلقات کو مزید خوشگوار کر دیا ہے، مزدور آجر کے جس کام کی ذمہ داری اٹھاتا ہے اسلامی نقطۂ نظر سے وہ ایک ایسا معاہدہ کرتا ہے جس کی پابندی اسے صرف اپنا پیٹ بھرنے کے لئے نہیں کرنی ہے، بلکہ اس کی اصل منزلِ مقصود یعنی آخرت کی بہتری بھی اسی پر موقوف ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

یاایھا الذین آمنوا اوفوا بالعقود (۵:۱)

"اے ایمان والو! تم اپنے معاہدوں کو پورا کرو۔"

اور ان خیر من استاجرت القوی الامین (۲۸:۲۶)

"بہترین اجیر وہ ہے جو قوی بھی ہو اور امانت دار بھی۔"

---

[1] ابن ماجہ (جمع الفوائد ص ۲۴۴ جلد اول)

نیز ارشاد ہے:

ویل للمطففین الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون و اذا

کالوھم او وزنوھم یخسرون۔ (۸۳: ۱)

"دردناک عذاب ہے ان ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے جو اپنا حق لینے کے وقت پورا پورا وصول کریں، اور جب انھیں ناپ یا تول کر دینے کا موقعہ آئے تو کمی کر جائیں"۔

فقہائے امت کی تصریحات کے مطابق اس آیت میں "تطفیف" یا ناپ تول میں کمی کرنے والے کے مفہوم میں وہ مزدور بھی داخل ہے جو طے شدہ اجرت پوری وصول کرنے کے باوجود کام چوری کا مرتکب ہو، اور اپنے جو اوقات اس نے آجر کو بیچ دیئے ہیں، انھیں آجر کی مرضی کے خلاف کسی اور کام میں صرف کرے۔ اس لئے ان احکام نے "کام چوری" کو گناہ عظیم قرار دے کر اجیر کو بھی یہ جتلا دیا ہے کہ جس آجر کا کام کرنا اس نے قبول کیا ہے، اس کی ذمہ داری اٹھا لینے کے بعد اب وہ خود اس کا اپنا کام بن گیا ہے، اور اس کے ذمہ ضروری ہے کہ وہ پوری دیانت داری، مستعدی اور لگن کے ساتھ اسے انجام دے، ورنہ وہ آخرت کی اس بہتری کو حاصل نہ کر سکے گا جو اس کا اصل منتہائے مقصود ہے۔

خلاصہ یہ کہ اسلام نے اجرتوں کے مسئلے میں رسد و طلب کے نظام کو ایک حد تک تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ آجر اور اجیر دونوں کے لئے کچھ ایسے احکام دیدیئے ہیں، کہ ان کی وجہ سے رسد و طلب کا یہ نظام خود غرضی کے بجائے اخوت و ہمدردی پر مبنی ہو گیا ہے۔

ہو سکتا ہے یہاں کسی صاحب کو یہ شبہ پیدا ہو کہ آجر اور اجیر دونوں پر پابندیاں عائد کرنے کیلئے قرآن و سنت نے جو احکام دیئے ہیں، ان کی حیثیت اخلاقی ہدایات کی سی ہے جو شخصہ

معاشی اور قانونی نقطہ نظر سے خارج از بحث ہیں۔۔۔۔۔ لیکن یہ اعتراض اسلام کے مزاج کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہوگا، یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اسلام محض ایک معاشی نظام ہی نہیں ہے، بلکہ وہ زندگی کا ایک مکمل دستور العمل ہے جس میں زندگی کے تمام شعبے باہم مربوط رہ کر ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک شعبے کو دوسرے تمام شعبوں سے کاٹ کر سمجھنے کی کوشش لازماً غلط فہمیاں پیدا کرے گی، اس کے ہر شعبے کا صحیح رول کار اسی وقت سامنے آسکتا ہے، جب اسے اس کے مجموعی نظام زندگی میں فِٹ کر کے دیکھا جائے، اس لئے اسلامی معاشیات کی بحث میں اِن اخلاقی ہدایات کو خارج از بحث قرار نہیں دیا جاسکتا۔

پھر اسلام کا ایک امتیاز یہ ہے کہ اگر ذرا وسیع نظر سے دیکھا جائے تو اس کی اخلاقی ہدایات بھی درحقیقت قانونی احکام ہیں، اس لئے کہ ان پر بالآخر آخرت کی جزا وسزا مرتب ہوتی ہے جس کو ایک مسلمان کی زندگی میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یہ "عقیدہ آخرت" ہی وہ چیز ہے جس نے نہ صرف یہ کہ اخلاق کو قانون کا درجہ عطا کیا ہے۔ بلکہ اصطلاحی قوانین کی پشت پناہی بھی کی ہے۔ قرآن کریم کے اسلوب پر اگر آپ غور فرمائیں تو نظر آئے گا کہ اس کے ہر قانونی اور اخلاقی حکم کے ساتھ "خوف خدا" اور "فکر آخرت" کے مضامین لگے ہوئے ہیں، اس میں اصل راز یہی ہے کہ درحقیقت قانون کی پابندی محض انسانی ڈنڈے کے زور سے کبھی نہیں کرائی جاسکتی؛ تاوقتیکہ انسان کی ہر نقل و حرکت اور ہر فکر و عمل پر پہرہ دینے کے لئے "فکر آخرت" موجود نہ ہو، یوں تو دنیا کی ہزارہا سالہ طویل تاریخ بھرپور قانونی جکڑبندیوں کے باوجود مظالم اور جرائم کی داستانوں سے بھری ہوئی ہے، اس ناقابلِ انکار حقیقت کی تصدیق کرتی ہے، لیکن خاص طور سے آج کی مہذب دنیا نے تو اسے روز روشن کی طرح عیاں کر دیا ہے کہ جس رفتار سے

قانونی مشینریوں میں اضافہ ہو رہا ہے، اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے جرائم بڑھ رہے ہیں۔

اس لئے یہ سمجھنا کہ "اجیر" اور "آجر" کے تعلقات محض قانونی جکڑ بندیوں سے درست ہو سکیں گے، انتہا درجے کی خود فریبی کے سوا کچھ نہیں، اس کا اصلی علاج صرف اور صرف "فکر آخرت" ہے، اور اسلام نے اس معاملے میں اسی پر زیادہ زور دیا ہے۔

آج کا ذہن جو محض دنیوی زندگی کے الٹ پھیر میں الجھکر "مادے" کے اس پار جھانکنے کی صلاحیت کھو چکا ہے، اس کے لئے شاید اس بات کو سمجھنا مشکل ہو، لیکن یقین ہے کہ اگر امن و سکون انسانیت کے لئے مقدر ہے تو وہ سینکڑوں ٹھوکریں کھا کر بالآخر اس حقیقت تک پہنچے گی، جس کی طرف قرآن کریم نے بار بار توجہ دلائی ہے، جس زمانے میں اسلام ایک عملی نظام کی حیثیت سے اس دنیا میں کار فرما تھا، اس وقت دنیا اس قرآنی نظریئے کی صداقت کو خوب اچھی طرح دیکھ چکی ہے، اس دور کی تاریخ میں "آجر" اور "اجیر" کے جھگڑوں اور ہڑتالوں کی کیفیت ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی جس نے کچھ عرصے سے پوری دنیا کو تہ و بالا کیا ہوا ہے، قرآن و سنت کی یہی وہ اخلاقی ہدایات تھیں جنھوں نے اس مسئلے کا اطمینان بخش حل پیش کر کے دکھایا، اور جن کی وجہ سے اسلام کے قرون اولیٰ کی تاریخ آجر کے جبر و تشدد اور اجیر کی ہڑتالوں سے تقریباً خالی نظر آتی ہے۔

تقسیمِ دولت کے ثانوی مدّات

اب تک ہماری بحث تقسیم دولت کے اوّلین حقداروں سے متعلق تھی۔
اسلامی نظریۂ تقیسم دولت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے معاشرہ کے کمزور عناصر کو قوی کرنے اور بیکار افراد کو قابل کار بنانے کے لئے عاملین پیداوار کے ساتھ دولت کے ثانوی مستحقین کی ایک طویل فہرست دی ہے، اور اس کا ایک باقاعدہ نظام بنایا ہے۔

مقالے کی تمہید میں اس بات کی طرف جامع اشارے کئے جا چکے ہیں، کہ دولت اصلاً اللہ کی ملکیت ہے، وہی اس کا پیدا کرنے والا ہے، اور اسی نے انسان کو اس پر ملکیت کے حقوق عطا کئے ہیں، انسان کو اس کے کسب وعمل کا جو بھی صلہ ملتا ہے، وہ اس کا مالک ضرور ہے، لیکن چونکہ کسب وعمل کی تمامتر تخلیق پھر توفیق اللہ ہی دیتا ہے، اور دولت کی تخلیق بھی اسی نے کی ہے، اس لئے انسان اپنی ملکیت کے استعمال میں قطعی طور پر خود مختار نہیں ہے، بلکہ اللہ کے احکام کا پابند ہے، لہٰذا جس جگہ خرچ کرنے کا وہ حکم دے دے، انسان کے لئے وہاں خرچ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

اسی بنیادی نظریئے سے عمل پیدائش کے علاوہ "استحقاقِ دولت" کا ایک دوسرا مد خود بخود نکل آتا ہے، یعنی ہر وہ شخص اسلامی نقطۂ نظر سے دولت کا مستحق ہے۔
جس تک دولت کا پہنچانا اللہ نے دولت کے اولین مالکوں کے ذمّے فرض قرار دیا ہے اس طرح تقیسم دولت کے ثانوی مدّات کی ایک طویل فہرست مرتب ہو جاتی ہے جن میں سے ہر ایک دولت کا مستحق ہے۔

اُن مدات کو مقرر کر کے اسلام درحقیقت یہ چاہتا ہے کہ دولت کو معاشرے میں زیادہ سے زیادہ گردش دی جائے، اور ارتکازِ دولت پر جو پابندیاں "سود" کی حرمت کے ذریعہ عائد کی گئی ہیں، انھیں مزید توسیع دی جائے۔ ان مدات کا تفصیلی بیان تو اس مختصر مقالے میں ممکن نہیں ہے، تاہم انھیں اختصار کے ساتھ شمار کیا جاتا ہے:

۱- زکوٰۃ

اُن میں سب سے پہلا اور سب سے زیادہ وسیع مد "زکواۃ" ہے۔ قرآن کریم نے بیشمار مقامات پر اس فریضے کو "نماز" کے ساتھ ذکر کیا ہے، ہر وہ شخص جو سونے چاندی، مویشی اور مال تجارت کا مقدار نصاب کی حد تک مالک ہو، اس کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ سال گذرنے پر اپنی ان مملوکات کا ایک حصہ دوسرے ضرورت مند افراد پر صرف کرے، اور جو شخص اس فریضے کو ادا نہ کرے، اس کے لئے قرآن کریم کا ارشاد یہ ہے کہ:

الذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم عذاب الیم، یوم یحمیٰ علیھا فی نار جھنّم فتکویٰ بھا جباھم وجنوبھم وظھورھم ھٰذا ما کنزتم لانفسکم فذوقوا ما کنتم تکنزون۔ (۹: ۳۵ و ۳۶)

"جو لوگ سونے اور چاندی کو جمع کر رکھتے ہیں اور اسے اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے، ان کو آپ دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے، جس دن اس (دولت) کو جہنم کی آگ میں گرم کیا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشانیوں

اور پہلوؤں کو داغا جائے گا، یہ وہ مال ہے جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا، چکھو جسے تم جمع کیا کرتے تھے۔

پھر اس زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے قرآن کریم نے آٹھ مصارف خود مقرر فرما دیئے ہیں:

اس طرح "زکوٰۃ" کے اس ایک مد کے لئے آٹھ مصارف مقرر فرما کر قرآن کریم نے دولت کی زیادہ سے زیادہ گردش کا دروازہ کھول دیا ہے

"زکواۃ" کے مصارف میں وجہ استحقاق کی قدر مشترک "ناداری" اور "افلاس" ہے اور اس مد میں افلاس ہی کے خاتمے پر زور دیا گیا ہے، اس طریقے سے نادار اور مفلس افراد کے درمیان کس وسیع پیمانے پر تقسیم دولت ممکن ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۶۵ء میں پاکستان کی قومی آمدنی تقریباً پندرہ ارب بیس کروڑ روپیہ تھی زکوٰۃ کی ادنیٰ ترین شرح یعنی ۲.۵ فیصد کے حساب سے اگر قومی آمدنی کی پوری زکوٰۃ نکالی جائے تو کم از کم اڑتیس کروڑ پچیس لاکھ روپیہ سالانہ صرف غریبوں میں تقسیم ہوتا ہے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر تمام مالکین پیداوار ہر سال باقاعدگی کے ساتھ زکوٰۃ نکالیں تو سالانہ کتنی خطیر رقم سرمایہ داروں کی جیب سے نکل کر غریبوں اور ناداروں کے پاس پہنچتی ہے، اور اس طرح تقسیم دولت کی ناہمواری کتنی تیزی سے رفع ہو سکتی ہے؟

۲۔ عشر

"عشر" درحقیقت زمینی پیداوار کی "زکواۃ" ہے، لیکن چونکہ اس پیداوار میں انسانی محنت کا دخل نسبتاً کم ہوتا ہے، اس لئے اس کی شرح ۲.۵ فیصد کے بجائے ۱۰ فیصد رکھی گئی ہے، "عشر" صرف ان زمینوں کی پیداوار پر واجب ہوتا ہے جو فقہی تفصیلات کے مطابق عشری ہوں، اور اس کو زکواۃ ہی کے مصارف

پر خرچ کیا جاتا ہے۔

۳۔ کفارات

معاشرہ کے کمزور افراد تک دولت پہنچانے کا ایک مستقل راستہ اسلام نے کفارات کے ذریعہ مقرر کیا ہے، کوئی شخص بلا عذر رمضان کا روزہ توڑ دے، یا کسی مسلمان کو بلا عمد قتل کر دے، یا اپنی بیوی سے ظہار کر لے، یا قسم کھا اسے توڑ دے تو بعض صورتوں میں لازمی اور بعض صورتوں میں اختیاری طور پر اسے حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے مال کا حصہ ناداروں پر خرچ کرے، یہ نقد روپیہ کی شکل میں بھی ہو سکتا ہے اور کھانے کپڑے کی صورت میں بھی۔

۴۔ صدقۃ الفطر

اس کے علاوہ جو لوگ صاحب نصاب ہوں ان کے لئے عید الفطر کے موقعہ پر لازم کیا گیا ہے کہ نماز عید کو جانے سے پہلے فی کس پونے دو سیر گندم یا اس کی قیمت مفلسوں، ناداروں، یتیموں اور بیواؤں پر خرچ کریں، رقم نہ صرف اپنی طرف سے بلکہ اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے بھی نکالی جاتی ہے، اور اس کے لئے مقدار نصاب کا "نامی" ہونا یا اس پر پورا سال گذرنا بھی ضروری نہیں ہے، لہٰذا اس فریضے کا دائرہ "زکوٰۃ" سے بھی زیادہ وسیع ہو جاتا ہے، اور اس کے ذریعہ خاص طور سے ایک اجتماعی مسرت کے موقع پر زیادہ سے زیادہ مساوات پیدا کی جا سکتی ہے۔

مذکورہ بالا چار مدات غریبوں اور مفلسوں میں دولت تقسیم کرنے کے لیے تھے، اس کے علاوہ دو مد دہ ہیں، جن سے اعزہ و اقربا کی امداد اور ان تک

دولت کا پہنچانا مقصود ہے، ان میں سے ایک مد نفقات کی ہے، اور دوسری وراثت کی

۵۔ نفقات

اسلام نے ہر انسان پر یہ ذمہ داری عائد کی ہے، کہ وہ اپنے خاص خاص رشتہ داروں کی معاشی کفالت کرے، پھر ان میں سے بعض تو وہ ہیں، جن کی کفالت ہر صورت واجب ہے، خواہ انسان تنگدست ہو یا خوشحال مثلاً بیوی، اولاد اور بعض وہ ہیں جن کی کفالت کی ذمہ داری وسعت کے ساتھ مشروط ہے، ایسے رشتہ داروں کی ایک طویل فہرست اسلامی فقہ میں موجود ہے، اور اس کے ذریعہ خاندان کے اپاہج، کمزور افراد کی معاشی کفالت کا بڑا اچھا نظام بنایا گیا ہے۔

۶۔ وراثت

اسلام کا نظام وراثت، اس کے نظریہ تقسیم دولت میں ایک بنیادی امتیاز رکھتا ہے، وراثت کی مرکز تقسیم سے تقسیم دولت میں جو ناہمواری پیدا ہوتی ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔ مغربی ممالک میں اس ناہمواری کا ایک بہت بڑا سبب یہی ہے۔ جس کا اقرار بہت سے ماہرین معاشیات نے کیا ہے۔

یورپ میں بالعموم اکبر الاولاد کی جانشینی کا طریقہ رائج ہے۔ جس میں سارا ترکہ بڑے لڑکے کو مل جاتا ہے، باقی سب محروم ہو جاتے ہیں، پھر بعض مقامات پر اگر مرنے والا چاہے، تو کسی دوسرے شخص کے نام اپنے سارے ترکہ کی وصیت کر سکتا ہے۔ اور اس سلسلہ میں اسے مذکر اولاد کو بھی محروم کرنے کا حق ہے۔ اس طریقے

کے نتیجہ میں دولت پھیلنے کے بجائے سمٹتی ہے۔ اس کے برعکس ہندو مذہب میں تقسیم وراثت کو مردوں میں تو اشتراکی حد تک مساوی کر دیا گیا ہے۔ لیکن عورتیں بہرحال وراثت سے محروم رکھی گئی ہیں جس سے ان پر ظلم ہونے کے علاوہ گردشِ دولت کا دائرہ اسلام کی نسبت سمٹ جاتا ہے۔

اس کے برخلاف اسلام نے تقسیم وراثت کا جو نظام بنایا ہے اس میں ان تمام خرابیوں کا انسداد ہو جاتا ہے۔ اس نظام کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:

(۱)۔ قرابت کے لحاظ سے وارثوں کی ایک طویل فہرست رکھی گئی ہے، جس کی وجہ سے متروکہ دولت زیادہ وسیع پیمانے پر پھیلتی ہے۔ یہاں یہ بات قابل نظر ہے کہ دولت کے وسیع پھیلاؤ کے پیش نظر یہ حکم دیا جا سکتا تھا کہ سارا ترکہ غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے یا بیت المال میں داخل کر دیا جائے۔ لیکن اس صورت میں ہر مرنے والا کوشش کرتا کہ وہ اپنی زندگی ہی میں سارا مال ختم کر جائے، اور اس سے معیشت کے نظام میں ابتری پیدا ہو جاتی۔ اس لئے اسلام نے لسے میت کے رشتہ داروں میں تقسیم کرنے کا نظام بنایا ہے جو مالک سرمایہ کی فطری خواہش ہے۔

(۲)۔ دنیا کے تمام نظام ہائے وراثت کے برخلاف عورتوں کو بھی میراث کا مستحق قرار دیا گیا ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا (۴:۷)

مردوں کے لئے (بھی) ایک حصہ ہے اس مال میں جو والدین اور اقربا،
چھوڑ کر جائیں۔ اور عورتوں کے لیئے بھی ایک حصّہ ہے اس مال میں
جو والدین اور اقارب چھوڑ کر جائیں، تھوڑے میں سے بھی اور زیادہ میں
سے بھی ایک معین حصہ ہے۔

(۳)۔ مرنے والے کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ کسی وارث کو محروم کر دے یا کسی
کے حصہ میں ترمیم کر سکے، اس طرح وراثت کے راستے سے ارتکاز دولت کا امکان
ختم کر دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

"اٰباؤکم وابناؤکم لاتدرون ایّھم اقرب لکم
نفعاً، فریضۃ من اللہ (۴: ۱۰)

"تمہارے باپ بیٹوں میں کون نفع کے اعتبار سے تم سے قریب تر ہے؟
تم نہیں جانتے! یہ اللہ کا مقرر کیا ہوا قانون ہے"۔

(۴)۔ چھوٹی اور بڑی اولاد میں کوئی تفریق نہیں کی گئی، بلکہ سب کو برابر
حصّہ دیا گیا ہے۔

(۵)۔ کسی وارث کے لیئے اس کے حصہ رسدی کے علاوہ کسی مال کی وصیت
کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے، اس طرح کوئی وارث متوفی کے مال سے اپنے
وراثت کے سوا کچھ نہیں پا سکتا۔

(۶)۔ متوفی کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ وارثوں کے سوا دوسرے لوگوں کے لئے
وصیت کر جائیں، اس سے بھی دولت کے پھیلاؤ میں مدد ملتی ہے، اور تقسیم
وراثت سے قبل دولت کا ایک حصّہ وصیت پر صرف ہو جاتا ہے۔

(۷)۔ لیکن وصیت کرنے والے کو اس بات کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ پورے مال کی وصیت کر جائے، بلکہ اسے اپنے مال کے صرف ایک تہائی حصہ میں ایسا کرنے کی اجازت دی گئی ہے، اس سے زیادہ کی وصیت کا وہ مجاز نہیں، اس طرح ارتکازِ دولت کے اس خطرے کا سدباب بھی کر دیا گیا ہے جو پورے مال کی وصیت کی اجازت کی صورت میں پیدا ہو سکتا تھا۔ اور اقرباء کے حقوق کو بھی محفوظ کر دیا گیا ہے۔

۷۔ ۸ خراج و جزیہ

مذکورہ بالا مدات کے علاوہ دو مدیں ایسی ہیں جن میں مالکانِ دولت کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی دولت کا کچھ حصہ حکومتِ وقت کو ادا کریں، ایک خراج اور دوسرا جزیہ۔

خراج ایک قسم کا زمینی لگان ہے، جو صرف ان زمینوں پر عائد کیا جاتا ہے۔ جو فقہی تفصیلات کے مطابق خراجی ہوں، اور اس کو حکومت اجتماعی کاموں میں صرف کر سکتی ہے، اور جزیہ ایک تو ان غیر مسلم افراد سے وصول کیا جاتا ہے جو اسلامی حکومت کے باشندے ہوں، اور حکومت نے انکے جان مال اور آبرو کی حفاظت کا ذمہ لیا ہو دوسرے ان غیر مسلم ممالک سے بھی جزیہ وصول کیا جا سکتا ہے جن سے جزیہ کی ادائیگی پر صلح ہوئی ہو۔ یہ رقم بھی حکومت کے اجتماعی مقاصد میں صرف ہوتی ہے۔

اوپر تقسیم دولت کے جو ثانوی مدات بیان کئے گئے ہیں، یہ سب وہ ہیں جن میں دولت صرف کرنا دولت کے اوّلین مالکوں کے ذمہ شخصی طور پر واجب قرار

دیا گیا ہے، غربا و مساکین پر اور مسلمانوں کے اجتماعی مقاصد میں خرچ کرنے کی جو ترغیبات قرآن و سنت میں وارد ہوئی ہیں، وہ ان کے علاوہ ہیں، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

یسئلونک ماذا ینفقون ــ قل العفو (۲: ۲۱۹)

لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں، آپ فرما دیجیے کہ جو بچ رہے۔

اس ارشاد نے واضح فرما دیا ہے کہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ بات یہ ہے کہ انسان صرف مقدار واجب خرچ کرنے پر اکتفا نہ کرے، بلکہ جس قدر دولت اس کی ضرورت سے زائد ہو، وہ سب معاشرے کے ان افراد تک پہنچانے کو اپنی سعادت سمجھے جو دولت سے محروم ہیں، قرآن کریم اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "انفاق فی سبیل اللہ" کے احکام و فضائل سے بھرے ہوئے ہیں۔

پیشہ وارانہ گداگری کا انسداد

معاشرہ کے کمزور افراد کو سرمایہ داروں کے اموال میں حق دلانے سے دوسری طرف معاشرہ میں اس خرابی کے امکانات تھے کہ معاشرہ کا یہ طبقہ مفلوج ہو کر ہمیشہ قوم پر بار بنا رہے۔ شریعت اسلام نے اس پر بھی گہری نظر کر کے اون کو بھی خاص قانون کا پابند بنایا ہے کہ

(۱)۔ تندرست توانا آدمی کو بجز مخصوص حالات کے سوال کرنے کا حق نہیں دیا، قرآن کریم نے "فقراء" کی قابل تعریف صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ

لا یسئلون الناس الحافا"

"یعنی وہ لوگوں سے لگ لپٹ کر سوال نہیں کرتے"۔

(۲)۔ جس شخص کے پاس ایک دن کے گذارہ کا سامان موجود ہو اس کیلئے سوال حرام کر دیا۔

(۳)۔ سوال کرنے کو حدیث میں ذلت قرار دیا۔

(۴)۔ جس شخص کے پاس بقدر نصاب مال موجود ہو اوس کے لئے بغیر سوال کے بھی صدقہ لینا حرام کر دیا۔

(۵)۔ غرباء و مساکین کو اس کی ترغیب دی کہ محنت مزدوری کی کمائی کو عزت سمجھیں صدقات سے گریز کریں۔

(۶)۔ ارباب اموال کو اس کی ہدایت کی اموال صدقات صرف اپنی جیب سے نکالنا کافی نہیں بلکہ اوس کے مستحقین حاجتمند لوگوں کو تلاش کر کے اون کو پہونچانا بھی ان کی ذمہ داری ہے۔

(۷)۔ محکمہ احتساب کے ذریعہ گداگری کا انسداد کیا گیا۔

ان احکام کے ذریعہ اسلام نے تقسیم دولت کا جو خوشگوار نظام قائم فرمایا ہے اس کے نتیجہ میں ہماری تاریخ میں ایسی مثالیں بھی ہیں کہ معاشرے میں صدقات کو قبول کرنے والا ڈھونڈے سے نہیں ملتا تھا۔ یہ اسلامی نظام تقسیم دولت کے چند نمایاں خدوخال تھے۔ اس مختصر مقالے میں اس نظام کی اتنی ہی جھلک دکھائی جا سکتی تھی لیکن امید ہے کہ ان گذارشات سے یہ بات واضح ہو گئی ہوگی، کہ اس معاملے میں اسلامی نظام معیشت سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں سے کس طرح ممتاز ہے اور اس کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں۔ وللہ الحمد اوّلہ وآخرہ وظاھرہ وباطنہ

بندہ محمد شفیع
خادم دار العلوم، کراچی ۱۴
یکم ذیقعدہ ۱۳۸۷ھ یکم فروری ۱۹۶۸ء

مسئلۂ سود

از مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ

ربا سود کی تعریف، متعلقہ آیات واحادیث کی دلنشین تشریح اور تجارتی و مہاجنی سود کی حرمت پر مفصل بحثیں، جاہلیت عرب کے ربوا کی تحقیق اور بینکنگ کے نظام پر بہترین تبصرہ۔ سود کی دینی دنیوی اور معاشی تباہ کاری پر سیر حاصل بحث

سائز ۲۳×۱۸/۸ اصفحات ۱۵۰ عکسی طباعت سفید کاغذ مع جلد قیمت

بیمۂ زندگی

از مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ

بیمہ یعنی انشورنس آجکل ہر قسم کے کاروبار میں ریڑھ کی ہڈی کی سی حیثیت حاصل کر چکا ہے لیکن اس سلسلے میں اسلامی تعلیمات کیا ہیں؟ اس سے ہم لوگ ناواقف ہیں۔ اس کتاب میں ہر قسم کے بیمہ اور انشورنس کے احکام قرآن اور سنت کی روشنی میں بیان کئے گئے ہیں۔

سائز ۲۳×۱۸/۸ عکسی طباعت، سفید کاغذ قیمت

پراویڈینٹ فنڈ پر زکواۃ اور سود کا مسئلہ

از مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ

پراویڈینٹ پر جو منافع یا سود حکومت دیتی ہے اس کا لینا جائز ہے یا نہیں؟ اور پراویڈینٹ فنڈ پر زکواۃ واجب ہوتی ہے یا نہیں ان مسائل کا شرعی حکم قرآن وحدیث کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے عکسی طباعت سفید کاغذ قیمت

چند تصانیف حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ

تفسیر معارف القرآن اردو ۸ جلد کامل
" جلد اول سورۂ فاتحہ و بقرہ
" جلد دوم آل عمران و نساء
" جلد سوم مائدہ تا انعام
" جلد چہارم اعراف تا ہود
" جلد پنجم یوسف تا کہف
" جلد ششم مریم تا روم
" جلد ہفتم لقمان تا احقاف
" جلد ہشتم محمد تا آخر
فتاوی دار العلوم دیوبند کامل
ختم نبوت کامل
مقام صحابہ
آلات جدیدہ کے شرعی احکام
تصویر کے شرعی احکام
ایمان و کفر قرآن کی روشنی میں
اوزان شرعیہ
رویت ہلال
تاریخ قربانی
سنت و بدعت
احکام دعا

دو شہید
فضائل بسم اللہ
کشکول
سیرت خاتم الانبیاء
شہید کربلا رض
ضبط ولادت (عقلی و شرعی حیثیت)
احکام حج و عمرہ
اعضائے انسانی کی پیوند کاری
آداب المساجد
ذکر اللہ اور فضائل درود و سلام
گناہ بے لذت
مصیبت کے بعد راحت
نجات المسلمین
مجالس حکیم الامت
رفیق سفر
آداب الشیخ والمرید
فقہی رسائل کا مجموعہ
معاشی اصلاحات
روح تصوف
علامات قیامت اور نزول مسیح

دار الاشاعت مقابل مولوی مسافر خانہ کراچی ۱